افسانے



# صلیب کا بوجھ

سکینہ وسیم عباس

کبھی تو لگتا ہے دنیا ہے قتل گاہ کوئی

اُٹھائے پھرتا ہے ہر شخص یاں صلیب اپنی

(ڈاکٹر مغنی تبسم)

تاریخ اشاعت :- ۲۷/دسمبر ۱۹۹۳ء
مطابق ۱۳/رجب المرجب ۱۴۱۴ھ
تعداد اشاعت :- پانچ سو
سرورق :- قیصر سرمست
کتابت :- فضل محمد
طباعت :- اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار۔ حیدرآباد
قیمت :- ۶۰ روپے
بیرون ہند :- ۵ ڈالر

: ملنے کے پتے :

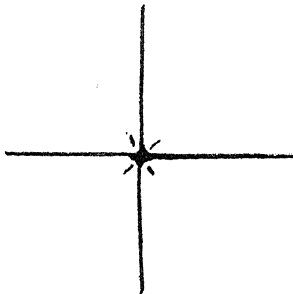
- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان، حیدرآباد
- 302، ماؤنٹ سنتوشی اپارٹمنٹس
میوری مارگ۔ بیگم پیٹ۔ حیدرآباد۔ 16۔۔۔۵

# انتساب

"میرے ہم نفس سید وسیم عباس کے نام اور بھائی
راشد آذر کے نام ——
جن دونوں کی حوصلہ افزائی نے مجھے قلم کار بنایا۔"

# فہرست

(صفحات)



ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

# مقدمہ

زیرِ نظر مجموعہ "صلیب کا بوجھ" سکینہ وسیم عباس کے بارہ افسانوں پر مشتمل ان کی پہلی کاوش ہے۔ سکینہ وسیم عباس پبلک سرویس کمیشن میں اسسٹنٹ سکریٹری ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ انجمن کے معتمد عمومی راشد آذر نے ان کے اندر چھپا ہوا جو "پبلک سرونٹ" ہے اسے پہچانا اور کہانیاں لکھنے کی ترغیب دی۔ وسیم عباس کے بہکاوے اور راشد آذر کے اکساوے میں آگئیں اور ان کا توسن قلم چل پڑا۔ سرکاری نوکری سے ان کی جمالیاتی تسکین کیا ہوتی ان کے اندر کا فنکار بے چین تھا۔ ترقی پسند مصنفین کی ادبی محفلوں نے اسے بیدار اور پھر متحرک کیا۔ نتیجہ یہ بارہ افسانوں کی پہلی کھیپ ہے۔ کہانیاں چنچل کھاتی ہیں کہ اور کہانیاں سکینہ کے ذہن میں کلبلا رہی ہیں۔

سکینہ کی کہانیوں میں وہ بھی ہیں جو سنجیدہ ہیں اور وہ بھی جو ہلکی پھلکی ہیں۔ ان کے کردار ان کے چلتے پھرتے ماحول کے آفریدہ اور ان کے جمالیاتی

خلوص کے پروردہ ہوتے ہیں۔ بعض کہانیوں میں کردار سے زیادہ کہانی کا مجموعی تاثر نمایاں ہے۔

پہلی ہی کہانی "وقت کا انتقام" قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ کہانی ایک "بڑی دیوڑھی" والے نواب کی ہے جو ابھی اپنے پرانے کروفر اور جھوٹے معیاروں پر اڑے ہوئے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں مجاہد اور اعجاز اور دونوں میں بہت فرق ہے۔ منشی بابا بڑی دیوڑھی میں ملازم ہیں۔ لیکن زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔

منشی بابا کی شادی ہوتی ہے لیکن ان کی بیوی کو دیوڑھی کا مصنوعی ماحول پسند نہیں اور نہ ہی اس ماحول میں ایک محنت کش اور محنت چور ایک ساتھ رہ سکتے ہیں چنانچہ وہ الگ رہنے لگتے ہیں۔ ستارہ ان کی بیٹی ہے۔ مجاہد کو اس سے محبت ہے۔ لیکن دیوڑھی کے رکھ رکھاؤ میں اس کا نبھاؤ نہیں ہو سکتا اس لئے نواب اور اعجاز دونوں ہی مخالفت کرتے ہیں مگر مجاہد ستارہ سے شادی کر لیتا ہے۔

سری کانت دونوں کا دوست ہے۔ مجاہد کی حمایت کرتا ہے اور اعجاز کو بدلتی دنیا کا تیور سمجھانا چاہتا ہے۔ پھر دوبارہ جب سری کانت اپنے وطن لوٹتا ہے تو حالات بدلے ہوتے ہیں۔ اعجاز کی شادی بڑے طمطراق سے ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس کی بیوی امریکہ میں ہے۔ ویزا آنے پر وہ بھی چلا جاتا ہے۔ وہاں امریکہ میں اعجاز کی بیوی کسی اور سے پینگیں لڑاتی ہے اور اعجاز سے اس کی طلاق ہو جاتی ہے۔ اب نواب کی حالت خستہ ہو جاتی ہے۔ ستارہ

کی عظمت دیکھئے اس نے نہ صرف اپنے بچے کو دادا کے پاس بھیجا کہ ان کا جی بہلے بلکہ مجاہد کو بھی بھیجا ـــــ ابھی تک ستارہ پر دیوڑھی کے دروازے بند تھے۔ سری کانت کی نواب سے بات ہوتی ہے۔ نواب اب پچھتا رہے تھے اور ستارہ کو لے آنے کے لئے کہتے ہیں۔ ستارہ ماضی کی ساری تلخیوں کو بھول کر دیوڑھی آجاتی ہے۔ اس کہانی میں مری ہوئی جاگیر داری سماج کے جھوٹے طمطراق اور نئی ابھرتی ہوئی سماج کے اچھے بُرے کا انکشاف ملتا ہے۔ ایک تو مجاہد کا حوصلہ پھر ستارہ کی بھی اپنی انا، اعجاز کا فخر اور اس کی سبکی، بڑے نواب کا پچھتاوا یہ جملے آپ کو چونکا دیں گے۔

" دیوڑھی والے اب بھی اپنے دلوں میں جھوٹی شان اور خود غرضی کے اندھیرے پھیلائے ہوئے ہیں جبکہ باہر کی دنیا تحقیق و تجسس کے میدان میں گامزن ہے" پھر آج کے نو دولتیوں نے ایک اور ابعاد کا اضافہ کیا ہے۔

" دیوڑھی کے اطراف کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہو گئی تھیں جن کی اونچائی نے دیوڑھی کی بلندی کو پست کر دیا تھا"

اس جملے کی اشارتی بلاغت غور طلب ہے۔ نئی عمارتیں پرانی دیوڑھی کو نیچا دکھا گئیں۔

" فراخ دل کون ؟" میں روشن کا کردار پوری کہانی پر چھایا ہوا ہے روشن کا شوہر لاری کے حادثے میں مر جاتا ہے اور اس کو ایک بچہ رحیم ہوتا ہے۔ روشن شہر میں ایک گھر میں کام کرنے لگتی ہے۔ مالکن اس سے خوش اور اس کے بچے رحیم پر مہربان ہوتی ہے۔

لیکن روشن کے تعلقات "نکڑ کے چائے والے" سے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حاملہ ہو جاتی ہے۔ بس جب یہ راز کھلتا ہے تو مالکن اُسے گھر سے کھڑے نکال دیتی ہے۔ رُوشن چلی جاتی ہے لیکن مایوس نہیں ہے۔ ایک وکیل صاحب کے پاس بہتر ماہوار پر کام کرنے لگتی ہے۔

مالکن کی ایک دوست رادھیکا ہوتی ہے۔ اس کے گھر زور و شور سے شادی ہوتی ہے لیکن یہ راز جب کھلتا ہے کہ اس کی بہو شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو جاتی ہے۔ رادھیکا کی بہو اپنے آپ کو جلا کر خودکشی کرنا چاہتی ہے دواخانہ لیجایا گیا۔ اس نے پہلا بیان تو یہ دیا کہ اُس نے اپنی مرضی سے خود کو جلایا ہے لیکن بعد میں ماں باپ کے اُکسانے پر بیان بدل دیتی ہے کہ سسرال والوں کے مظالم سے تنگ آکر خودکشی کی ہے۔ سسرال والے گرفتار کر لئے جاتے ہیں لیکن بہرحال چھان بین کے بعد اصلی دستاویز دواخانے سے حاصل ہو جاتی ہے جس میں اس کے حاملہ ہونے کا ذکر ہوتا ہے۔ سسرال والے چھوٹ جاتے ہیں۔ اب روشن اپنی پہلی مالکن کے پاس آتی ہے رحیم بھی ساتھ ہے مالکن نے رُوشن اور رادھیکا کی بہو کا موازنہ کیا "گناہ کا پہناوا ایک لیکن زندگی کا لباس الگ الگ" مالکن کی نظر میں روشن اونچی اُٹھتی ہے وہ پھر اُسے اپنے پاس کام پر رکھ لیتی ہے اور روشن اپنی زیادہ تنخواہ والی نوکری کو چھوڑ کر پُرانی مالکن کے پاس آجاتی ہے "فراخ دل کون ہے؟ روشن ہی تو ہے۔" رادھیکا کی بہو تہذیب کی پروردہ اور روشن تہذیب سے ناآشنا" ایک اپنے فعل کیلئے معاشرے کو جواب دہ اور دوسری معاشرے کے لئے بے معنی ایک نے خودکشی

کی دوسری نے اپنے جذبات کے دھارے کو موڑ دیا"۔

"سچ کا دکھ" میں شہریار نکسلائیٹ تحریک سے متاثر ضرور ہے لیکن اس میں شریک نہیں۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب ہوتا ہے اور یہ بات اس کے نکسلائیٹ احباب کو پریشان کرتی ہے کہ وہ جوان کے رازوں سے واقف تھا ان کے لئے عذاب نہ بن جائے۔ اسی لئے اُسے فسادات کے زمانے میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ شہریار کا باپ یہ سمجھتا ہے کہ وہ فسادات میں مارا گیا۔ شہریار کے باپ کا دوست بھی اسی گاؤں کا تھا۔ اور فسادات کے تھمنے کے بعد اپنے دوست سے ملنے آتا ہے۔ راستے میں ایک نوجوان ملتا ہے اور ساری کہانی سُناتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں بھی شہریار کے باپ سے ملنے جا رہا ہوں تاکہ اُسے حقیقت بتلا دوں۔ اور پھر اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر دوں ۔ اسی کے ساتھی تو شہریار کے قاتل تھے۔

فسادات پر ایک بہت خوبصورت کہانی "دیکھو میں زندہ ہوں" ہے۔ یہ پنجاب کی دہشت پسندی کا افسانہ ہے۔ دہشت پسندوں کی گولیوں سے ایک بس کے مسافر مارے جاتے ہیں ۔ سریندر سنگھ اس خبر سے پریشان ہے اور فیکٹری میں حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے۔ سریندر سنگھ کا ایک دوست اسے اپنے گھر لے جا کر اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کا بیٹا سندیپ اس کی خدمت کرتا ہے لیکن اس کی آنکھیں خراب ہیں اور آپریشن سریندر سنگھ کے دہشت زدہ علاقے میں ہی ممکن ہے۔

سریندر سنگھ، سندیپ اور اس کا باپ اس علاقے کو جاتے ہیں

سندیپ کا آپریشن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں دہشت پسندوں کی سرگرمیاں پھوٹ پڑتی ہیں۔ سریندر سنگھ اور اُس کا بیٹا باہر نکل پڑتے ہیں تاکہ سندیپ اور اس کا باپ محفوظ رہیں۔ دہشت پسندوں کی مار سے سریندر سنگھ کا بیٹا دجیندر سنگھ مر جاتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کی لاش لئے گھر آتا ہے۔

سندیپ سریندر سنگھ کے پاؤں سے لپٹ گیا اور سریندر سنگھ کو محسوس ہوا کہ دجیندر سنگھ کہہ رہا ہے "دیکھو میں زندہ ہوں"

ایک اور کہانی "قد آور" بھی غور طلب ہے۔ قدسیہ نے انور کو پال رکھا ہے نوکر ہے لیکن ہر جگہ ساتھ لیجاتی ہے۔ بڑوں کی دعوت میں انور کی بے عزتی ہوتی ہے۔ اسے ہٹا دیا جاتا ہے لیکن انور کے کلاس میٹ کے گھر دعوت ہے۔ دیپو انور کو ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے انور کو لگتا ہے کہ یہاں اپنا پن ہے وہ امیروں کی دعوت کی بیگانگی یہاں [illegible] بھی نہیں سکتی۔ انور قدسیہ سے کہتا ہے کہ ہم صرف دیپو جیسی دعوت میں جائیں گے۔ یہاں "قد آور" کون ہے؟ انور یا دیپو یا دونوں!

دوسری کہانیاں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن "لاش کی قیمت" کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہانی بس کے اس حادثے کے بعد لکھی گئی ہے جبکہ وہ حسین ساگر کی ریلنگ کو توڑ کر تالاب میں گر پڑی اور بہت سے مسافر مارے گئے۔

راجا کی رامی سے شادی تو ہو جاتی ہے لیکن رامی کا باپ لالو پریشان ہے اس نے گاؤں میں سب کچھ کھو کر شہر میں پناہ لی۔ قبائلی لوگوں کو

جواب تک بلڈنگ مزدور کا کام کر رہے تھے زمین ملتی ہے لیکن بلڈر اُن سے زمین خرید لیتا ہے۔ لالو کے باپ کی قبر بھی ایک زمین پر تھی جہاں اب گھر بن گیا ہے۔ لالو اپنی بیٹی سے کہتا ہے تم اس گھر کو نمسکار کرتے ہوئے کام پر جانا۔ اُسی گھر میں راجا کام کرتا ہے۔

راجا اور رامی کی شادی کے بعد لالو اپنے گاؤں جانے کے لئے بس میں سوار ہو جاتا ہے اور اسی بس کو حادثہ ہوتا ہے راجا اور رامی جاتے ہیں۔ لاش کی شناخت کرتے ہیں حکومت نے دو ہزار معاوضہ دیا ہے۔ رامی کہتی ہے یہ لاش کی قیمت ہے۔ کہانی کی المناکی قاری پر چھا جاتی ہے۔

غرض کہانیوں کا یہ مجموعہ سکینہ کی پہلی پیش کش ہے اور سکینہ خود انجمن ترقی پسند مصنفین کی پیش کش ہے۔ یقین ہے قارئین ان کہانیوں سے بہت کچھ حاصل کریں گے۔

راج بہادر گوڑ

۲۶ / نومبر ۱۹۹۳ء
حیدرآباد

اقبال متین

# "صلیب کا بوجھ"
# کی
# صدائے بازگشت

حُسنِ اظہار کے کتنے ہی بند دریچے ہیں یا کتنی ہی کھلی کھڑکیاں، کبھی اس کی حزن سامانی کبھی شگفتہ بیانی، تحریر کو انفرادی رنگ سے آشنا کرواتی ہے اور پھر کہانی خود بھی اپنے کھلنے، وا ہونے اور قاری کے ذہن پر مرتسم ہونے کے لئے نت نئے اندازِ اظہار کا مطالبہ کرتی ہے' بات بن جاتی ہے تو بڑی بات ہے، نہیں بنتی تو چھوٹی بات۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بات کی اپنی اہمیت کچھ بھی ہو، موضوع کتنا ہی ارفع ہو، الفاظ اگر اس کے بطون کا تعین نہیں کرتے اس کے کرب کا یا اس کے انبساط کا بوجھ اٹھالینے کا یارا نہیں رکھتے ہیں تو بات ان کہی، ان سنی رہ جاتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سکینہ ان باتوں سے بے بہرہ ہیں یا اتنی انکھیاری نہیں ہیں۔ وہ جتنے کھلے دل اور کھلے مزاج کی خاتون ہیں اسی کھلے کھلے بیانیہ سے اپنی کہانی کو گزارتی ہیں! ان کی اکثر کہانیوں میں وہ رمز آشنا گیرائی کم کم ہی ملتی ہے جو بیانیہ کو تہہ در تہہ بناتی ہے۔

ان کی تحریر میں الفاظ کی روانی سے جو بیانیہ تخلیق پاتا ہے

وہ سادہ بھی ہے کہیں کہیں پرکار بھی۔ ان کی کہانی قدآور ان کی تحریر کی ایسی ہی چابک دستی کی مثال ہے۔ جس کا برتاؤ معاشی و معاشرتی نابرابری کے شدید احساس سے کہانی کو گزار کر قدسیہ اور انور کو ایک ایسے احتجاجی نکتۂ عروج تک لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر آئینے میں انور کا عکس جو ایک عام لڑکے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ قدسیہ کو قدآور نظر آتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انور کی معصومیت کے باوصف اس کے ڈھکے چھپے تلخ احساسات کی آنچ نے قدسیہ کی انسان دوستی کو تپا تپا کر اس ( CLIMAX ) تک نہیں پہنچایا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو یہاں یہ بات عیاں ہے کہ قدسیہ خود سکینہ ہیں اور یہ بھی غیر واضح نہیں کہ وہ کہانی کی اسی بات کو واحد متکلم کا سہارا لے کر نہیں کہہ سکتی تھیں کہ اُن کا انکسار اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتا اور پھر ذراسی لغزش سے کہانی کے مجروح ہونے کا بھی خدشہ تھا۔

ان ساری باتوں کے باوجود کہانی اکہری سی لگتی ہے لیکن اس اکہرے پن کے دور ہو جانے کے امکانات تھوڑی سی ریاضت سے اور روشن ہو جائیں گے۔ میں اپنے تئیں یہ بتا دوں کہ میں کسی بھی فن لطیف کو بالکلیہ اللہ کی دین نہیں سمجھتا تاوقتیکہ وہ انسانی ریاضت کا بارِ گراں اٹھائے تخلیق کے ساتھ نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ جب یہ بوجھ بھی فن بن جاتا ہے تو تخلیق کے اکھوے سنگلاخ چٹانوں سے بھی پھوٹتے ہیں۔

میں نے سکینہ کی کہانیوں میں اتھلے پن کی نشان دہی بھی کی ہے اور پھر امید افزا صورت احتمال کا بھی فوری اظہار کیا ہے۔ یہ بات میں نے بغیر کسی تقویت

کے نہیں کی ہے بلکہ میں نے اس ہزار پا کن کھجورے کو سکینہ ہی کی ایک کہانی "زندہ قانون" میں پکڑ لیا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ "بیانیہ" جہاں کہانی کی سب سے بڑی قوت ہے وہیں کہانی کا اضمحلال بھی اسی میں چھپا ہوا ہے اگر وہ ابھرا، سپاٹ اور اکھڑا ہے۔

"زندہ قانون" تہہ دار کہانی ہے۔ اس کہانی کو سکینہ نے چار مختلف رنگوں کی تصویروں کو ایک سفید گتے پر چسپاں کر کے بنایا ہے۔ یہ کہانی بادی النظر میں ایک (PAINTING) سی لگتی ہے لیکن جوں جوں آپ ان تصویروں کے اندر اترتے جاتے ہیں یہ دلچسپ انکشاف ہوتا ہے کہ ہر تصویر اپنا ایک الگ مفہوم اور زاویہ رکھتے ہوئے بھی اپنی تہوں سے ابھر کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہے۔

"گوکل نگر" کے میدان کو زندگی کی علامت بنا کر سکینہ نے پیش کرنے کی شعوری کوشش کی یا نہیں یہ تو وہ جانیں لیکن کہانی اپنے قاری کے لئے یادو میلے میں زندگی کی بھرپور شمولیت، اس کی چہل پہرت، اس کی گہما گہمی اس کی چہل پہل کا ایک ایسا سماں پیش کرتی ہے جہاں حزن و ملال کے سائے دور، دور تک نظر نہیں آتے۔

"اس دن یادو قبیلے کی عورتیں مانگ میں سیندور رچائے قیمتی ساریوں کے زریں پلّو سے اپنا سینہ سجائے سج دھج کر گھر سے نکلتیں۔ ان کے مرد اور بچے سر پر رنگ برنگی پھچے دار

شملے باندھے میلے میں شریک ہوتے ان کے ساتھ ان کے
سجے سجائے بیل ہوتے۔ اس دن ان بیلوں کی قسمت کا
ستارہ عروج پر ہوتا، انہیں خوب نہلایا دھلایا جاتا ان
کے سینگوں کو رنگا جاتا۔ ان کے جسموں پر رنگین نقوش بنائے
جاتے ان پر زرین گوٹے کی چادریں اڑھائی جاتیں۔ گلے میں
پھولوں کے ہار ڈالے جاتے۔ گویا وہ میلے کے دولہا ہوتے اور
ان کے مالک براتی "

اور اس کے بعد گوکل کنھیا، یشودھا کا لال دنیا بھر کی محبت بٹورلیتا

آہستہ آہستہ یہ تصویر دھندلاتی ہے اور نازیہ اپنی ترنگ اور جولانی کو
ساتھ لئے اس میلے سے گزر جاتی ہے۔ کچھ ہی قدم پر اس کو گرجا گھر دکھائی دیتا
ہے۔ اس کی شوخیٔ طبع پلک جھپکاتے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے
اور یہاں زندگی اپنا دوسرا روپ نازیہ کے آگے بغیر کسی پیش بندی کے بچھانے
لگتی ہے۔ ذہن و دل اس روپ کو اپنے اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ یہ روپ شعور و
ادراک کا روپ ہے۔ یہ روپ زندگی کے حزن و ملال کو اثاثۂ جاں بنا کر سب
کچھ تج دینے کے لئے نفسا نفسی کی انسانی جبلت کو بنی نوع آدم کے لئے قربان کر دینے
کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہی نازیہ اپنی بیک وقت مندی مندی اور کھلی کھلی آنکھوں
سے اس منظر میں کھو جاتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے۔

" صلیبی جگہ پر بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ اس دن فلپائن کے
ایک شہر سے جلوس نکالا جاتا ہے۔ صلیبی واقعہ کو دہرانے

والے اس جلوس میں وزنی صلیبیں اٹھائے چلتے ہیں۔ اس
سال بھی گیارہ آدمیوں نے صلیبی واقعہ کو دہرایا تھا۔ اُن
کا کہنا تھا کہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے گناہ بخشوانے کیلئے
صلیبیں اٹھاتے ہیں جب ان کا جلوس صلیبی جگہ پہنچا تو
صلیبیں لٹا دی گئیں اور ان گیارہ آدمیوں کے ہاتھوں میں لوہے
کی کیلیں ٹھونکی گئیں پھر یہ لوگ پانچ منٹ تک صلیب پر
لٹکے رہے۔"

نازیہ اس ماحول میں گم صم ہے۔ اس کا ذہن انبساط سے چھوٹ کر ریخ دمحن کا رازداں ہوگیا ہے، وہ انسانی دکھ درد کا مداوا تلاش کرنے میں اپنے آپ سے رحلت کر جاتی ہے۔

"کیا ہی اچھا ہوتا یہ وزنی صلیبیں اٹھائے چلنے والے گیارہ
آدمی صبر و تحمل اور ضبطِ نفس کی صلیب اٹھا لیتے اور عقیدت
کے جلو میں یسوع مسیح کے بتائے ہوئے غور و فکر کے راستہ
پر چل پڑتے جو برائیوں کے دھندلکوں کو چھانٹتا ہے اور
بصیرت کے آئینہ کو چمکاتا ہے۔"

پھر ایک پردہ سا گرتا ہے۔ نازیہ کے ذہن کو یکایک ایک جھٹکا لگتا ہے۔ چار حیران آنکھیں اسے گھورتی دکھائی دیتی ہیں اور پچھلی دونوں تصویریں اپنے سارے (BACK GROUND) کے ساتھ کہیں اندھیروں میں کھو جاتی ہیں اور اس اندھیرے سے زندگی کا ایک اور ہی روپ جنم لیتا ہے۔ استحصال کا

گراوٹ کا، دریدہ دامنی و درندگی کا روپ ۔ انسانیت کے قتل اور شیطنت کے ننگے ناچ کا اعلان کرنے والا روپ ۔ ایسا روپ جس کی خون آلودگی کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ ایسا روپ جس کا خون آشام زہر آج آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے۔

نازیہ مجبور محض ہے۔ عورت کی ساری عظمتیں، بہناپے اور ممتا سے لے کر گھر ہستی تک سہاگ کی بیوگی بن گئی ہیں۔ اور نازیہ جبراً اس مقام تک لائی گئی ہے کہ اس کی ساری اس کے بدن سے جدا ہو کر قادر کے ہاتھ پر لپٹی ہوئی ہے۔

اس تصویر تک پہنچتے پہنچتے سکینہ کی تحریر پھر اپنی تہہ داری کھو دیتی ہے۔ وہی اکہرا پن کہانی کے تاثر کو مجروح کر دیتا ہے۔ کہانی پر سکینہ کی گرفت یہاں سے ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ ذرا سی دقت پسندی کو اپنا شعار بنا لینے سے کہانی سنبھل سکتی تھی۔ ایک حد تک بس میں چھیڑ چھاڑ کی تفصیل غنیمت ہے لیکن کہانی کی اٹھان سے لگا نہیں کھاتی۔

سکینہ اجازت دیں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں کہ وہ اس سہل پسندی سے اجتناب کر سکیں تو کہانی ان کے قلم کی ایسی روشنائی بن سکتی ہے جو ان کی تحریر کے لیے مختص ہو۔

یہ تصویر اس وقت دھجیاں ہو جاتی ہے جب سفید ایمبیسڈر کار کو متحرک رکھنے والا ڈیزل انجن اپنی گھڑ گھڑاہٹ سے اس ماحول کی بے سکونی کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ یہاں ڈیزل انجن کسی صنعتی دور کا سمبل نہیں ہے بلکہ اس کی آواز دریدہ صفت ماحول میں انسانی ہمدردی کی آواز کا متقاضی بن کر

ابھرتی ہے۔ اس آواز نے ایک اجنبی کو چوتھی تصویر میں اس طرح اجاگر کیا ہے کہ وہ برائیوں کو زیر کر کے ماحول کی ساری گندگیاں سمیٹ لیتا ہے اور اپنے ڈیزل انجن کی کار میں ٹھونس کر چلا جاتا ہے اور ایسے میں نازیہ سوچتی ہے ' اس نے موہن کا شکریہ تک ادا نہیں کیا مصیبتوں کے ٹل جانے کے بعد یہ تاسف نازیہ کے ذہن کو ایک نہ کیئے گئے سجدۂ شکر کی صورت بے آرام کر دیتا ہے۔

ادھر خواتین افسانہ نگاروں میں نسائی کرداروں اور صنف نازک سے ہمدردانہ رویہ عام ہوتا جا رہا ہے جو ان کا فطری حق ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارا معاشرہ آج بھی مرد کی افضلیت کے اطراف گھومتا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے میں بعض وقت سوچتا ہوں کہ شائد عورت مرد کی ہمسری کا دعویٰ بھی اگر کرتی ہے تو مرد کا سہارا لے کر ہی کرتی ہے کہ عورت پن کی تکمیل کے لئے وہ اسی سہارے کو کئی کئی روپ میں خود جنم دیتی ہے، پرورش کرتی ہے اور اس کی ہو رہتی ہے اور پھر اسی پر فخر بھی کرتی ہے۔ ورنہ اس افسانے کے ایسے CLIMAX کا سکینہ کے پاس کیا جواز ہے۔ اس ایپیسوڈ میں تین چار عورتیں بھی تو اتفاقاً آ سکتی تھیں جو ان دو بزدل لونڈوں کو گھرکی دے کر بھگا دینے کے لئے کافی تھیں '

طبقاتی نابرابری کے شدید احساس نے یوں لگتا ہے کہ سکینہ کے ذہن پر گہرے ارتسامات چھوڑے ہیں ان کی بیشتر کہانیاں اس موضوع کا احاطہ ہمدردی اور انفرادی نگاہ کے ساتھ کرتی ہیں۔ اس کے پیچھے نرگسی " ازم "

کی چھاپ ہے، نہ کسی بندے ٹکے فلسفۂ حیات کی چوکسی جو تخلیق کار کو کتابی اکتساب سے حاصل تو ہو جاتی ہے۔ احساس کی آنچ کا حصّہ نہیں بن پاتی، سکینہ اور ان کے شوہر وسیم عباس سر برآوردہ خاندان کے افراد ہیں۔ آج بھی سلیقے سے مثالی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن سکینہ اپنی اس کامیاب زندگی سے کچھ غیر مطمئن سی اس لئے رہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں، اُن کا سُکھ چین ان کے خاندان کے ایسے افراد کے حصّے میں بھی آئے جو دور و نزدیک سے ان کی زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ سکینہ پڑھی لکھی خاتون ہیں، اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہیں لیکن ان کے مزاج کی سادگی ان کا رہن سہن ان کا پہناوا، ان کا انداز تکلم اس بات کی واضح نشان دہی کرتا ہے کہ وہ کسی ایسی زیادہ قیمتی شئے کو اپنے اندر چھپائی ہوئی ہیں جس کی جوت ان ساری نعمتوں کو جو انہیں حاصل ہیں سایۂ پس دیوار سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ یہ جوہر جس کی جوت میں آنکھیں موند موند کر وہ عرفانِ ذات کا سودا کرتی ہیں وہ ہے انسانی اٹوٹ ہمدردی کا جذبۂ بے اختیار۔ جب یہ جوہر انسانی دکھ درد رکھنے والے کسی بھی ذہن میں اجارہ دار بن جاتا ہے تو فن کار اپنا سکون اپنے ہی ہاتھوں سے گنوا بیٹھتا ہے اور احتجاج کی کھلی آواز بن کر اپنے فن میں ابھرتا ہے مجھے مزید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ احتجاج فن کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔

اس مجموعہ میں اُن کی کئی کہانیاں "بازگشت" "وقت کا انتقام" "عبرت" "راستہ حق شناسی کا" "اور پھر بنگلہ بک گیا" "قد آور" "اور" "فراخ دل کون" اسی موضوع و مرکزی تصور کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں کسی موضوع سے یہ وابستہ

البتہ سا اضطراب، یہ لگی لگی سی بے حسی کیا فن کو جلا نہیں بخشتے ؟

اسی مجموعہ کی ایک اور کہانی " رشتہ حق شناسی کا " بھی بڑی حد تک سنبھلی ہوئی کہانی ہے۔ موضوع وہی ہے جو سکینہ کا اپنا مخصوص ہے وہ سب کچھ اس کہانی میں بھی مل جاتا ہے جو مشرقی عورت کے لئے سکینہ کی لگاوٹ اور اخلاص کے سبب ان کی اکثر نگارشات میں ملتا ہے۔ بس ایک یہی بات کھٹکتی ہے کہ سکینہ بیانیہ کو تہہ دار بنانے کے گر سے واقفیت رکھنے کے باوجود کیوں اغماض کر جاتی ہیں۔ وہ زیادہ صیقل کرتیں تو اس افسانے کو بھی " فراخ دل کون " کے برابر رکھا جاسکتا تھا۔

" فراخ دل کون " سلجھی ہوئی ایسی کہانی ہے جو اچھی کہانی کے لوازمات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ روشن آہستہ آہستہ قاری کے ذہن میں جگہ بنانے لگتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کہانی میں بیانیہ کا اکہرا پن نہیں ہے جو کسی شخصیت کو ٹائپ تو بنا دیتا ہے کیرکٹر بننے نہیں دیتا۔ دیکھئے سکینہ نے کس تہہ داری سے روشن کے کردار کو ابھارا ہے۔ لکھتی ہیں۔

> " جب روشن کو ہمارے پاس رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا تو اس نے میرے اعتماد کی ساری سیڑھیاں عبور کرلیں۔ اب گھر میں کنجیوں کا گچھا بھول جانے پر مجھے وحشت نہیں ہونے لگی "

" ضمیر " اور " انا " کے مکالموں نے بھی اس کہانی کو تقویت پہنچائی ہے۔ اس کہانی میں سکینہ نے خود کو بھی کہانی کا ایک کردار بنا لیا ہے اور

" FIRST PERSON " میں کہانی بیان ہوئی ہے ایسے میں انہوں نے روشن کو خود پر فوقیت دی ہے اور اُس غیض و غضب کے بعد بھی جو روشن کی جنسی بے راہ روی کی سرزنش کا " میں " سے مطالبہ کرتا ہے۔ سکینہ نے روشن کو معاف کر دیا اور قبول کر لیا ہے۔ یہاں پھر ایک مختصر سے جملے نے جو روشن کی زبان سے ادا ہوتا ہے اُس فریب و استحصال کی پردہ داری کی ہے جو روشن کی نسائی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح سکینہ اپنی ملازمہ " روشن " کو لادھیکا کی بہو سے اوپر اٹھا لیتی ہیں۔

" مجھے معاف کر دیجئے بی بی جی - اب یہ کہنا بے کار ہے کہ میں اس عمر میں بھی دھوکا کھا گئی - میں جا رہی ہوں "

میرے نزدیک اس مجموعے کی سب سے خوبصورت کہانی " بازگشت " ہے۔ اس کہانی میں مجبور محض انسان کی نفسیاتی گرہیں ناخن ناخن کھلتی ہیں۔ اس کہانی میں جبر و استبداد کے تازیانوں کی چوٹ سرمائے کے ہاتھوں نکبت و افلاس پر ہی نہیں، تخلیق کار اور قاری کے ذہن پر بھی پڑتی ہے۔

اس کہانی میں پرت پرت غم و اندوہ اس طرح جھل جھل کرتے ہیں جیسے انبساط و مسرت کو کچوکے لگا رہے ہوں۔ اس کہانی میں بیانیہ کا حسن TWIST ہو ہو کر نکھرتا ہے۔ اس کہانی کی خوبیاں گنانے میں بات طویل ہو جاتی ہے۔ اس کہانی میں ایک مقام پر تیز روی سے ٹھوکر کھاتے کھاتے سکینہ بچ نکلی ہیں - اس کہانی میں سکینہ نے رمز و کنائے کی جوت جگائی ہے اور اختصار و اجمال کو طولِ کلام پر افتخار بخشا ہے - دیکھئے اس کہانی کا موضوع بھی اسی

طبقاتی کشمکش، اسی سماجی اونچ نیچ اسی غیر انسانی استحصال، اسی معاشرتی کیف وکساد کا احاطہ کرتا ہے جو سکینہ کو بے آرام رکھتا ہے اور یہی بے آرامی کل اُن کے فن کی جان بن جائے گی۔ میں سکینہ سے کہانی پر اسی عقابی گرفت کا متقاضی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ وہ موضوع کو اپنی نس نس میں سرایت کر جانے کا موقع دیں اور جب ٹیسیں ناقابلِ برداشت ہو جائیں، قلم اٹھائیں کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے باوجود بات نہیں بنتی۔

کہانی عجیب پُراسرار صنف ہے کبھی اتنی سج دھج سے سامنے آکر بیٹھ رہتی ہے کہ اُس کی ساری عشوہ طرازیوں سمیت آپ اسے کاغذ پر بچھا بچھا دیں، پسار پسار دیں۔ غلام عباس کو "آنندی" اسی طرح مل گئی ہو گی اس کے بعد انہوں نے کہانی کو بہت سہل الحصول سمجھ لیا۔ میں ان سے اس بات پر بالکل متفق نہیں ہوں۔ یہی کہانی کبھی ہاتھ ہی نہیں لگتی۔ ہاتھ لگتی ہے تو اُس کا رنگ اتر جاتا ہے اور یہ رنگ انگلیوں کی پوروں سے کاغذ پر اُسی سج دھج سے منتقل نہیں ہوتا۔

میں بھی سکینہ کی طرح انہیں راستوں کا راہی ہوں۔ کبھی کبھی دماغ کی رگیں جب کسی موضوع کو مزید سنبھال کر رکھنے کا یارا کھو دیتی ہیں اور یہ خدشہ لگ جاتا ہے کہ اب یہ رگیں پھٹ پڑیں گی یا پھر کہانی HAUNT کرتی کرتی خود کہیں گپھاوں میں مر جائے گی تو میں نے قلم اٹھا لیا ہے لیکن کیا کروں کہ اس کے باوجود ایسا بھی ہوا ہے کہ نہ سرخ رو ہو سکا نہ وہ خوشی کہانی نے مجھے دی جس کا میں متلاشی تھا۔ تخلیق کا کرب، دردِ زہ سے زیادہ ہونا چاہئے

اور یہ بات مجھ سے بہتر سکینہ سمجھ سکتی ہیں بات اور طویل ہو جائے گی۔ اس لئے
میں اس کہانی کے کچھ چھوٹے چھوٹے اقتباسات کی پیش کشی پر اکتفا کروں گا۔

" میں اگر ثمینہ آپا کی جگہ ہوتی تو آپ کی قربانی میں لتھڑی
ایسی شادی کو کبھی قبول نہ کرتی ۔ اچھا بتایئے۔ آپ کے جذبات؟
کیا وہ کوئی معنی نہیں رکھتے !!؟ "

______ " راضیہ "

" کیا آنٹی مماں کی اور بہنیں نہیں ہیں ؟ کیا اُن کی لڑکیاں
اسلم میاں کے قابل نہیں ؟ وہ بھلا اپنی لڑکیوں کا بیاہ بیمار
اسلم میاں سے کیوں رچائیں گی ۔ ایسا وقت پڑنے پر امیر بہنوں
کو غریب بہنوں کی لڑکیوں کی یاد آجاتی ہے ۔ "

______ " راضیہ "

" آمنہ نے اپنی دکھتی آنکھیں ثریا بیگم کی جانب پھیریں
اور پوچھا ۔
" مصیبت آپ پر کیوں آئے گی آنٹی مماں "

______ " آمنہ "

" شادی کے بعد تم ہر وقت اسلم میاں کے ساتھ رہو گی اور
کچھ عرصہ کے لئے اپنے ماں باپ اور بہنوں کو بھول جاؤ گی۔ تمہارے
گھر سے کوئی فرد تم سے ملنے نہیں آئے گا جب تک کہ میں نہ بلاؤں
میں نے جو روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے وہ تمہاری ماں کو مل جائے گا "

______ " ثریا بیگم "

ماں نے اسلم میاں کے ذکر کا سہارا لیا۔ اور کہا ماشاء اللہ اب اسلم میاں کے دوروں ( FITS ) کی شکایت میں کمی ہو گئی ہے وہ صحت مند دکھائی دے رہے ہیں "

"ماں"

---

" اور آمنہ آپا؟ " راضیہ نے بے چینی سے پوچھا

" راضیہ"

---

آمنہ بہت کمزور ہو گئی ہے ...... کیا بتاؤں آمنہ ماں بننے والی تھی لیکن ثریا بیگم نے اس کو ماں بننے نہیں دیا۔ کہتی ہے کہ شادی کی شرائط میں یہ نہیں تھا "

"ماں"

---

پسچ کا دکھ پہلے تو چھٹی ڈسمبر ۹۲ء کے جس سانحہ عظیم کو کہانی کا مرکزی خیال متصور کیا گیا ہے وہ اس کہانی میں ایک معمولی حادثے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کر اخباری رپورٹ کی طرح لعن طعن سے کسی قوم کی ہائے مالی کا دل دونیم کر دینے والا حادثہ کوئی تاثر قاری کے ذہن پر نہیں چھوڑتا۔ اس سانحہ عظیم کو بنیاد بنا کر ایک ہونہار نوجوان کے قتل پر شدت احساس کو جھنجوڑ کر کسی انفرادی غم کو اجاگر کرنے کی سعی نامشکور کی گئی ہے۔ جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ کہانی ختم ہونے تک بھی غم و اندوہ کی ایسی ہمدردانہ فضا تیار نہیں کر سکی جو کسی قوم اور ملک کی غیر انسانی سفاکانہ بیدردی و استبداد کو ساری دنیا کے آگے شرمسار ٹھہراتی ہے۔ اس پر مستزاد اس جملے سے کہ

"شہریار کے ڈیوٹی پر رجوع ہونے سے پہلے ہی ۶؍ ڈسمبر
ایک قیامت بن کر آئی"

کہانی کا سارا ڈھکا چھپا، کسی بھی قاری کے سامنے واضح ہو جاتا ہے اور کہانی اپنا رہا سہا تاثر بھی کھو بیٹھتی ہے۔ اپنے گاؤں کی تباہی کا بوجھ ذہن پر اٹھائے حامد صاحب گاؤں کی طرف چل پڑتے ہیں جبکہ انہوں نے برس ہا برس سے گاؤں کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ حامد صاحب نے یہ تک نہیں سوچا کہ اس وقت تو جان کے لالے پڑے ہیں۔ ان حالات میں ان کا یہ سفر ہی ایک غیر نفسیاتی عمل ہے یوں لگتا ہے کہ کہانی کی تخلیق ہوئی اسی لئے ہے کہ شہریار کو جام شہادت پلایا جائے اور حامد صاحب کہانی کے قاری کے آگے واویلا مچائیں اور بابری مسجد درمیان میں لٹکتی رہے۔ حامد صاحب نے تو اس مہم کو بھی برابر نہیں کیا کہ قاری کہانی کے ساتھ چلتے ہوئے شہریار کے غم میں ناصر صاحب کے لئے باعث تسلی بنتا۔ خود حامد صاحب فلسفہ طرازی پر اتر آتے ہیں۔

"بیٹا تم جاؤ میں خود میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ اس دکھ بھرے شخص سے آنکھیں ملاؤں۔ ہاں اس ستم رسیدہ شخص سے اتنا ضرور کہہ دینا کہ اس کے دوست حامد نے کہا ہے کہ ہمارے گاؤں کے اسکول اور کالج نے جہاں ہونہار سپوت پیدا کئے ہیں وہیں زہریلے ناگ بھی پروان چڑھائے ہیں انہیں زہریلے ناگوں نے ہماری دھرتی کے بدن کی رنگت نیلی کردی ہے"

میرے نزدیک ایسی فلسفیانہ موشگافیوں کا ایسے موقع پر کوئی محل ہی نہیں ہے جو نہ کسی اجتماعی غم کے جذبے کو ابھارتی ہیں یا دلاسہ دیتی ہیں۔ اور نہ کسی انفرادی غم کے۔

یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے کہانی کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے اور سکینہ سے اس کہانی کی حد تک زیادتی کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں سکینہ سے مستدعی ہوں کہ وہ اپنے قلب کی وسعتوں میں میرے اس جہل کو بھی کہیں چھپالیں کہ وہ بہرحال اچھی افسانہ نگار بھی ہیں، فن کار بھی اور دلِ درد آشنا رکھنے والی خاتون بے مثال بھی۔

میں سکینہ کے دوسرے مجموعے میں موضوعات کے تنوع کا انتظار کروں گا اور صرف اسی لئے کروں گا کہ وہ کہانی سوچنے "بننے" برتنے اور وقت پڑے تو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رفو کرنے کا گر جان گئی ہیں۔

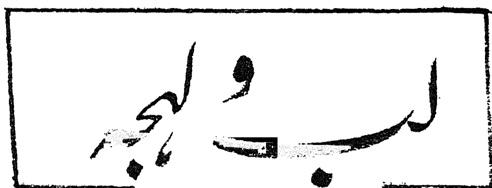
اقبال متین

۲۱ دسمبر ۱۹۹۳ء

"کہانی" کتاب نگر۔ نظام آباد

اے پی (۵۰۳۰۰۱)

رافعہ منظور الامین




سکینہ وسیم عباس کی کہانیوں کا مجموعہ "صلیب کا بوجھ" پڑھنے کو
ملا، اور مجھے خوشی حاصل ہوئی۔

مجھے ان کی تحریر میں ایک گیرائی اور گہرائی لگی۔ مجھے ان کی سوچ ان کی اپنی
سوچ لگی ــــ میں نے محسوس کیا کہ ان کی تحریر ــــ تحریر برائے تحریر نہیں۔ بلکہ
اس میں ان کی فکر ان کا تدبر بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ الفاظ غور
سے پڑھیئے۔

"سامنے دیوار پر سرکتی پیہم کی سرخ لکیر نے میرا ذہن متوجہ کر لیا۔ چیونٹیاں!
اس موسم میں! میں حیران ہو گئی پھر سوچنے لگی کتنی چھوٹی سی جان ہے چیونٹی کی اور
کتنی محنت کرتی ہے وہ۔ لیکن اپنی کسی ہم جنس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی"۔

اسی محنت کا پرتو مجھے سکینہ کی تحریروں میں ملا۔ لیکن صرف محنت

ہی نہیں۔ اس میں ان کے خیالات اور جذبات کا عمل دخل بھی ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ الفاظ پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔

سکینہ کو بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اپنے خیالات کو وہ سادہ لفظوں میں ادا کرتے ہوئے اچانک بات کو ایسا موڑ دے دیتی ہیں جس سے قاری استعجابی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

اوپر لکھے ہوئے فقروں کو پڑھیے اور پھر آخری جملے پر غور کیجئے۔ اس میں طنز کا بھرپور وار ہے جو پڑھنے والے کو غور و فکر پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہی کسی ادیب کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ قاری اس کے ذہنی سفر میں جو بھی موڑ آئیں اس کا شریک ہو۔ پڑھنے والا inspire ہو۔ ادب کے میدان میں سکینہ کے خوش آئند مستقبل کے لئے میری نیک تمنائیں۔

رفیعہ منظور الامین

# تاثر

سکینہ وسیم عباس کی ادبی تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شخصیت کو پیش نظر رکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس ریاضت سے خرمنِ ادب کی خوشہ چینی کیلئے اپنا ذہن بنایا۔ معاشرے کے اخلاق اور سماجی اقدار کو پرکھنا تو ہر ادیب کا شعار ہوتا ہے لیکن ہر ادیب کے حالات، تجربات، علمی سطح اور نفسیاتی پس منظر مختلف ہونے سے اس کا زاویہ نگاہ بلکہ رویہ جُدا گانہ ہوتا ہے۔ غرض کسی کی ادبی حیثیت جو بھی ہو اس کا مطمحٔ نظر تخلیقی ارتقا ہونا ضروری ہے۔

یہاں یہ صراحت بجا ہے کہ کسی ادیب کے نجی کردار اور اس کی ذہنیت کا اس کی تخلیقات پر اثر ہوتا ہے۔ بیشک یوں بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ادیب، شاعر یا افسانہ نگار ادبی اعتبار سے لکھتا اور کہتا کچھ ہے اور اس کی عملی زندگی اور نظریات میں ہم آہنگی ہو تو فکری گہرائی کے ساتھ علمی صداقت کا مظاہرہ بہتر ہوتا ہے۔

جہاں تک اس افسانہ نگار کا تعلق ہے ہماری قریبی رشتے داری سے

ہٹ کر قربتیں زیادہ ہیں۔ چنانچہ مجھے ان کی زندگی کے حالات اور ذہنی پس منظر سے بہت حد تک واقفیت ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیق سے قبل اور تخلیق کے دوران اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے فقط زندگی کے تقاضوں کو قبول ہی نہیں کیا، اس کی تلخیوں کا بارِ گراں سہنے کا حوصلہ بھی پیدا کیا۔ بس یہی حوصلہ جذبۂ ایثار کی شہادت پیش کرنے صریرِ خامہ میں ڈھلنے لگا اور اس کا عنوان "صلیب کا بوجھ" بن گیا۔

اب دیکھئے ان کی شخصیت کیسے اُبھری۔

ریاستِ حیدرآباد میں "شریف گھرانے" سے مراد، ایسے بھی گھرانے تھے جن کی پہچان فقط شرافت تھی۔ نہ شان و شوکت سے کوئی تعلق تھا نہ اعلیٰ عہدہ داری کی کچھ تمنّا، نہ مرتبے کے لئے ضمیر فروشی ہوتی۔ یہاں مذہبی تعلیم اور اخلاقی تربیت ضروری تھی۔ امورِ خانہ داری جاننا فرض تھا۔ دکن کی بادشاہت کے زیرِ اثر مخصوص آداب سکھائے جاتے جو امرائے سلطنت سے لے کر عام شہریوں میں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ لوگ قناعت میں مگن رہتے۔ ایسے ہی ایک گھرانے کی پروردہ سکینہ وسیم عباس ہیں۔ سرکاری نوکری کرتے ہوئے اپنے رسیا شوہر وسیم عباس (افسانہ نویس) کے ساتھ جو فطرتاً بھولے بھالے ہیں مگر اپنی آزاد خیالی و آزاد شربی کی خاموش تبلیغ کرنے میں ہٹ رکھتے ہیں، خوشگوار ازدواجی سفر طے کرنے کے لئے انھیں خود کو نئے سانچے میں ڈھالنا پڑا۔ دوسری طرف خاندانی روایات کا تہیہ دل سے نبھانا کرتے ہوئے اپنے سسرال کے بزرگوں کی خدمت کی بدولت انھیں ورثہ میں دعائیں ملیں۔ ضرورت مند اور بے سہارا ملازم کے

دکھ درد کو اپنا سمجھنا، یوں محسوس ہوتا ہے ان کے گھر میں خیر و برکت کا باعث ہوا۔ دل و دماغ مومن ہونے کے ناطے حقیقتوں کا مشاہدہ کرنے میں ایمانداری کا ثبوت دیا۔ کسی زمرۂ حیات میں ذرا بھی اختلاف کا شعلہ بھڑکتا دکھائی دیا تو اپنا دامن بچاتے ہوئے مباہلہ کا بوجھ مخالفین پر ڈال دیا۔

اپنے مکان پر ایسی نشستوں کا اہتمام کرتی رہیں جن میں راشد آزر اور میری شرکت لازم ہوتی۔ ادبی و مذہبی عنوانات پر غیر جانبدارانہ گفتگو کے مواقع ان کے لئے سود مند ہوئے۔

موصوفہ کے خیالات اور عملی زندگی میں تصادم نہیں ہے وہ اپنے عقائد کی حد تک کٹر نہیں۔ آپ اپنی نقاد بھی ہیں۔ یعنی آپ اپنی اصلاح کرنے کا مادہ رکھتی ہیں۔ یہ مذہب کی پابند ہیں۔ ان کے دوست الگ الگ مکتبِ خیال کے ہونے کی وجہ سے ان سے مخلصانہ روابط رکھنے کی وجہ سے ان کے لئے یہاں کے مذہبی رسم و رواج اور یہاں کی تہذیبی رنگارنگی کا مطالعہ بصیرت افروز ہوا۔ جیسے کہ ایک ادیب بلکہ ہر دانشور کے لئے کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

اب کچھ موضوعات کی بنا پر تنقیدی پہلو نکلتے ہیں۔ میرے اظہار کے لئے حافظ کا یہ مصرع صادر آتا ہے۔

دانش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم

سکینہ وسیم عباس موجودہ حالات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہیں۔ لاعلمی اور احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کسی خاص طبقے یا نظام کے تعلق سے متعصبانہ رائے قائم نہیں کرتیں۔ جیسے کہ آج کل کھوکھلے ذہن والوں کا انداز بن گیا ہے اور

ایک فیشن ہو گیا ہے کہ اپنے آپ کو جدت پسند بتانے جاگیر دارانہ و برطانیہ راج پہ لعن طعن کرے۔ گھسی پٹی باتوں پر وقت کیوں ضائع ہو۔ انھیں احساس ہے کہ ہر دور میں ایک نظام ہوتا ہے ایک مدت یا زمانے کے بعد وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اچھائی اور برائی کسی خاص طبقے وغیرہ پر موقوف نہیں۔ وہ خوب جانتی ہیں کہ آج ہمارے ملک اور معاشرے کے مسائل نہایت عبرت انگیز ہیں۔ ہماری سیاست اور چند شر پسند گروہوں کی طرف سے مجرمانہ کردار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا دانشورانہ تجزیہ کرنے سے ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟ آج جبر و ظلم کے ذمے دار سرمایہ دار نہیں۔ ایک عام سچا ہوا فرد بھی ہوس پرستی اور فساد پرستی کے تحت درندہ بن جاتا ہے اور شریف افراد اور معصوموں کا استحصال کرتا ہے ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے موصوفہ کی پیشکش پر نظر ڈالئے۔

"دیکھو میں زندہ ہوں" میں پنجاب میں دہشت گردی کا دور دورہ ہے مگر عام لوگوں کا جذبۂ ہمدردی فنا نہیں ہوا۔ بعض مکالمے پڑھنے سے عام آدمی کے دماغ میں یہ بات آئے گی کہ ہمارے شروع کے سیاسی لیڈروں نے زبردست غلطیاں کی ہیں اصل میں آج کے ماحول میں ہماری تاریخ حقائق کی روشنی میں دہرائے جانے کی محتاج ہے۔ ملاحظہ ہو "ملک کا بٹوارہ ہوا تو ہم نے کیسی کیسی قربانیاں دیں اب علاقوں کا بٹوارہ کیا معنی رکھتا" "آخر یہ لوگ علیحدہ علاقہ کیوں چاہتے ہیں بھائی" "ملک کو مزید بٹوارے سے بچانے کے لئے ہمیں اور کتنی قربانیاں دینی پڑیں گی" "یہ لوگ تو اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں" یا "ان لوگوں کا کیا ہو گا جن کے دل ایک نامعلوم ملنے والے زخم

سے مجروح ہو گئے ہیں" اب یہ جملہ تاریخ یکجہتی کی جان ہے " رواداری اور محبت تو ہماری تہذیب کی بنیاد ہے"۔

" فراخ دل کون ؟" میں مفاد بینی کی سطحوں سے بلند ہو جاؤ" اس دور کی قومی ذہنیت پر ضرب ہے۔ آگے مفکرانہ رنگ بھی ملتا ہے۔ " قلب و ضمیر کی آوازیں" اور " وہاں منہ میں انا کی لگام تھی"

" اور پھر بنگلہ بک گیا" میں پرانی اور نئی نسل کی ذہنی کشمکش نمایاں ہے

" لاش کی قیمت" یہ عنوان چونکا دینے والا ہے۔ یہاں حادثات جو انتظامی لاپرواہی اور غیر ذمے داری بڑھ جانے سے ہوتے ہیں ان میں مارے جانے والوں کے متعلقین کو بے شک معاوضہ دیا جاتا ہے مگر جان کا دام کیا ہو سکتا ہے۔

" عبرت" میں زینو چاچا ایک حقیقی کردار ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدرآباد کے انضمام کے بعد یعنی پولیس ایکشن کے بعد اکثر شرفاء زندہ درگور تھے۔ بعض لٹے پٹے یا تو شومئ قسمت یا ناعاقبت اندیشی اور کوئی مجبوری کے تحت کبھی سنبھل نہ سکے۔ زینو چاچا ضعیفی میں بدلے ہوئے حالات کا کس حد تک مقابلہ کرتے۔ آخر ان کی زندگی کا فسانہ ختم ہوا مگر ان کی بیٹی کا سلوک ناقابلِ معافی رہ گیا۔ آج بھی زینو چاچا کو یاد کرنے والے زندہ ہیں۔

" وقت کا انتقام" میں دوستی کی پہچان اور بزرگانہ وضعداری کی جھلک جا بجا ملتی ہے لیکن کچھ ایسی بھی باتیں ہیں جو مصنفہ کی محتاج توجہ رہ گئیں۔ شاید یہ غفلت سہواً ہوئی ہو۔ شادی کا جوڑا پہننا فرسودہ روایت نہیں بلکہ ایک رواج ہے۔ لیکن اس کے لئے مجبوری ہو تو بکھیڑ کرنا حماقت ہے۔

منشی جی کی بیٹی کی شادی برابر دو دلوں کا میل ہے جو اونچ نیچ کے تفرقے سے پرے ہے۔ اونچ نیچ کا تفرقہ شروع سے ذات پات کی تقسیم اور طبقاتی امتیاز کے سبب سے ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی وضاحت کرنی چاہیئے تھی کہ منشی جی اس ڈیوڑھی کو چھوڑ کر اس سے الگ جگہ رہنے لگے۔ اس لئے کہ معاشرتی نظام بدلنے سے رہن سہن میں تغیر آیا۔ مشترکہ خاندان کا رواج زیادہ نہ رہ سکا اور نوابی ماحول ختم ہوتا گیا اس سے قدیم و موروثی ملازمین تاحیات ڈیوڑھی میں نہ رہ سکے جیسے کہ عہد رفتہ میں ہوتا تھا۔

سکینہ وسیم عباس کا شیوہ صرف پڑھنا سیکھنا اور لکھنا ہے۔ صحت مند تنقید کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ شہرت بیجا کی بالکل قائل نہیں۔ غرض ان کی سوچ اور ان کے تجربوں کے تحت جذباتی گہرائی کی عکاسی ان کی تحریروں میں ملے گی۔ بہت سی باتیں ایسی بھی جو آئندہ مجموعوں میں آسکتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری زبان تغیرات زمانے کے ساتھ ساتھ کس قدر نئے نئے تقاضوں کی آئینہ دار ہے۔ کیا موجودہ اردو کا مقام اور اسکی بقاء کے مسائل کو سمجھتے ہوئے آج کے ادیب شاعر اور افسانہ نگار بذات خود یہ جائزہ لیتے ہیں کہ کون اپنی انا کو ہٹا کر اردو کی ارتقاء کیلئے کس طرح کا رول ادا کر رہا ہے۔

اپنے تاثر کے اختتام پر یہ بھی عرض کرونگا کہ موصوفہ مزید علمی نظریات اور تہذیب کا تقابلی مطالعہ کریں جیسے کہ ہر ابھرتے ہوئے ادیب کو چاہیئے۔ فکر و نظر میں جتنی وسعت پیدا ہو اتنا ہی عالمگیر برادری کا تصور اجاگر ہوگا۔

• ذکی شاداب

۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ء

# دیباچہ

ایک عظیم ہستی کا قول ہے کہ "انسان کی جہالت اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ وہ اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانے"

میری جہالت کا اندھیرا دور کیا میرے ہم نفس سید وسیم عباس نے اور مجھ میں چھپے قلم کار کو پہچانا بھائی راشد آذر کی بیدار نظر نے۔

اِن دونوں کی حوصلہ افزائی سے میرے ادب کے اُجالے اُبھر آئے۔ وسیم مجھے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں لے گئے اور میں اس انجمن کی رکن بن گئی۔ وہاں مجھے افسانہ نگاروں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو سُننے کا موقع ملا۔ جن کے تجربات و مشاہدات افسانوی شعری اور مضمونی پیکر میں ڈھل کر میرے احساسات کو متحرک کرتے رہے۔ میں اپنی تلاشِ منزل کی جستجو میں سرگرداں ہو گئی۔ میری فکر کا پرندہ پَر تولنے لگا۔ اور پھر ادب کی فضا میں پرواز کرنے لگا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے میری پہلی کاوش۔ میرے افسانوں کا مجموعہ "صلیب کا بوجھ"۔

اپنے افسانوں کے بارے میں یہ لکھنا پسند کرونگی کہ میں نے اپنی نظر کے مطابق ہندوستانی عورت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو مجھے مظلوم بھی ملی، وفا کی دیوی بھی اور باغی بھی۔ افسانہ "بازگشت" کی آمنہ اپنی مظلومی کو ایثار اور قربانی کے اعلیٰ قدروں کے نذر کر دیتی ہے اور اپنی باغی طبیعت والی بہن راضیہ کو بھی یہی سبق سکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن "صلیب کا بوجھ" والی باغی شیلا اپنی دوست نرجس سے پوچھتی ہے کہ "عورت کی قربانی" عورت کا ایثار کس کے لئے ہے؟ کیا ان بے حس بے مروت اور اخلاق سے گرے ہوئے انسانوں کے لئے؟ جو اپنے عمل سے انسانوں سے زیادہ حیوانوں کی صف میں کھڑے کئے جانے کے قابل ہیں" زمانے کی مفاد پرستی اور خود غرضی کے ہتھوڑے شیلا کی خودی کی چٹان کو توڑتے رہتے ہیں اور اس کی خود اعتمادی کو کمزور کرتے ہیں پھر بھی وہ اپنی صلیب کا بوجھ تنہا اٹھائے موت کے گلے لگ جاتی ہے۔ "وقت کا انتقام" والی ستارہ بھی باغی عورت ہے۔ جب "بڑی دیوڑھی" والوں نے اُسے بہو کے روپ میں قبول نہیں کیا تو اس نے بھی شادی کے روایتی جوڑے کو فرسودہ نظام کا رواج کہہ کر اہمیت نہیں دی اور اپنے محبوب مجاہد سے سیول میرج کرلی۔ جب بڑے نواب کو اس بات کا احساس ہوا کہ انہوں نے ستارہ سے انصاف نہیں کیا تو اُسے اپنے بلا بھیجا۔ گویا اپنی بہو قبول کر لیا۔ مجاہد کے سمجھانے پر کہ بڑے نواب اندر سے ٹوٹ گئے ہیں، ستارہ ماضی کی تمام تلخیوں کو اپنی فرض کی چادر میں چھپا کر بڑے نواب سے ملنے جاتی ہے۔ "رشتہ حق شناسی کا" کی خانم وفا کی دیوی ہے۔ ادنیٰ ہوتے ہوئے اعلیٰ کردار کی حامل ہے اور حق شناسی کا تقاضہ پورا کرتی ہے۔ اس طرح یہ سارے

کردار اپنی اپنی جگہ حقیقی ہیں جن کی تصویریں میں نے اپنی کتاب کے قرطاس پر ابھاری ہیں۔

میں نے اپنے دور میں فرقہ وارانہ فسادات زیادہ دیکھے ہیں اسی لئے میرے کئی افسانوں کا موضوع "فسادات" ہے۔ میرے افسانوں میں ابہام کا حسن نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں زندگی کی کڑوی کسیلی حقیقتیں بغیر ابہام کے بھی کہی جائیں تو تاثر پیدا کرتی ہیں۔

میں تہہ دل سے احسان مند ہوں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی۔ جو بزرگ نقاد، دانشور اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرپرست ہیں جنھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود اپنا وقت نکالا کہ میرے افسانوں پر طویل مقدمہ لکھ سکیں۔

میں بہت ممنون ڈاکٹر مغنی تبسّم کی جو نامور شاعر نقّاد اور دانشور ہیں۔ جنھوں نے میری کتاب کا فِلاپ لکھا۔ جن کے شعر سے میری کتاب کا پہلا صفحہ جگمگا رہا ہے۔

میں خلوصِ دل سے شکر گزار ہوں مشہور و ممتاز افسانہ نگار بھائی اقبال متین صاحب کی جنھوں نے ناسازیٔ طبیعت کے باوجود اپنے "صلیب کا بوجھ" کی بات میں مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ محدود تجربے کی بنیاد پر لکھے گئے میرے افسانوں کا انھوں نے تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ ان کا خلوص ہے کہ اتنا طویل پیش لفظ میرے لئے لکھا۔

میں تہہ دل سے احسان مند ہوں مایہ ناز مشہور و ممتاز خاتون ناول و افسانہ نگار رفیعہ منظور الامین کی جنھوں نے میرے افسانوں کو اپنے "لب و لہجہ" میں سراہا۔

میں بہت ممنون ہوں ذکی شاداب کی جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں مشہور ہیں۔ جنھوں نے "تاثر" میں میرے افسانوں کا فکری گہرائی سے جائزہ لیا۔ اور میری شخصیت کا احاطہ کیا۔

اگر میں بھائی راشد آذر، مشہور و ممتاز شاعر و نقاد کا شکریہ ادا نہ کروں تو میرا دیباچہ ادھورا رہ جائے گا۔ میں نے ان کے اشعار سے اپنے افسانوں کو مزین کیا ہے۔ وسیم کے نام اور بھائی راشد آذر کے نام اپنی کتاب منسوب کر کے میں نے اپنا حق شکر گزاری ادا کیا ہے۔

میں شکریہ ادا کرتی ہوں فضل محمد کا جنھوں نے اس مجموعے کی کتابت میں بہت مدد کی ہے۔

قیصر سر[illegible] نے جس خلوص سے میری کتاب کا سرورق تیار کیا ہے اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔

★ سکینہ وسیم عباس
[illegible] سکریٹری۔ آندھرا پردیش
پبلک سروس کمیشن۔ حیدرآباد

# وقت کا انتقام

جب کبھی وقت کے ماتھے پہ شکن پڑتی ہے
کہنہ تہذیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے



**سری کانت** ایک جرنلسٹ تھا۔ بیرونی ممالک میں رہتے ہوئے جب تین سال کا عرصہ بیت گیا تو اُس کو وطن کی یاد ستانے لگی وہ ایک ہفتے کے لئے وطن چلا آیا۔ ایرپورٹ پر اترتے ہی وطن کی مٹی کی خوشبو میں ملی جلی کئی یادیں اُس کے ذہن کے پردے پر لہرانے لگیں۔ ایرپورٹ کے جھمیلوں سے نمٹ کر جب وہ باہر آیا تو دیکھا اس کی ماں باہیں پھیلائے بیقرار کھڑی ہے۔ وہ دوڑ کر ماں کے سینے سے لپٹ گیا۔ پھر رشتہ داروں کے گلے لگا۔ اُس کی آنکھیں ان دوستوں کو ڈھونڈتی رہیں جن کا کہیں پتا نہ تھا وہ بھلا وہاں کیسے آتے۔ سری کانت کو خط و کتابت سے چڑ تھی، اپنے خطوط کا جواب نہ پاکر دوستوں نے بھی اُسے لکھنا بند کر دیا۔ اس طرح وہ اپنے دوستوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔

سری کانت کے گھر بھر رشتے داروں کا تانتا لگا رہا۔ دیس پردیس کی باتیں ہوتی رہیں۔ قہقہے ابلتے رہے ان قہقہوں نے سری کانت کو مجاہد اور اعجاز کی یاد دلا دی
مجاہد اور اعجاز دو بھائی تھے۔ دونوں ہی اُس کے دوست تھے۔ اس کے ساتھ کالج میں

پڑھتے تھے۔ ان کا تعلق شہر کی مشہور "بڑی دیوڑھی" سے تھا۔ بات بات پر قہقہے لگانا ان کے مزاج کا حصہ تھا۔

اب دن ڈھل رہا تھا۔ سورج کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ شام کی ٹھنڈی اور ہلکی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ سری کانت کے رشتے دار ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تھے۔ سری کانت ٹھنڈی ہوا کا مزہ لینے کے لئے اپنے اپارٹمنٹ کی چھت پر چلا گیا اور کھلے آسمان کو دیکھنے لگا وہاں شفق کے رنگین پردے آویزاں ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں سورج کی سنہری کرنوں سے آسمان جگمگا رہا تھا۔ ستاروں کی قندیلیں ابھی روشن نہیں ہوئی تھیں۔ اپارٹمنٹ کے گیٹ کے قریب کھڑے اونچے اونچے ناریل کے درخت سری کانت کو تک رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر سری کانت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے ستارہ کی یاد آ گئی۔ ستارہ جو ناریل پانی بڑے شوق سے پیا کرتی تھی۔

ستارہ سے اس کی پہلی ملاقات باغِ عامہ میں ہوئی تھی جہاں وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں کھڑی ناریل پانی پی رہی تھی۔ اس وقت مجاہد نے سری کانت کو چپکے سے بتایا تھا کہ ستارہ ان کے منشی بابا کی لڑکی ہے اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ستارہ اردو کالج میں پڑھتی ہے۔ مجاہد کو دیکھ کر ستارہ ناریل ہاتھ میں پکڑے ان کے پاس چلی آئی۔ مجاہد نے اس کا تعارف سری کانت سے کرایا۔ پھر ان کی ملاقاتیں کالج کے جلسوں میں

اردو کانفرنسوں میں، باغ عامہ میں ہونے لگیں۔ تکلف کی حدیں ٹوٹنے لگیں۔ دوستی کا نور پھیلنے لگا۔ سری کانت نے محسوس کیا کہ ستارہ بلا کی ذہین ہے۔ وہ طبعاً کم گو ہے لیکن جب بولتی ہے تو حریف کو اس کی مخالفت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک دن سری کانت نے مجاہد کی آنکھوں میں ستارہ کے لئے محبت کا پیغام پڑھا۔ محبت کا یہ پیغام سری کانت کے دل میں مسرت کی لہریں کر اترا۔ وہ مجاہد کا رازدار بن گیا۔ مجاہد کے عشق کی گرمی نے ستارہ کے دل میں بھی محبت کی جوت جگائی۔ محبت کی آگ دونوں کے دلوں میں اس حد تک بڑھی کہ "بڑی دیوڑھی" کے مکینوں نے اس کی حرارت محسوس کرلی۔ دیوڑھی کے در و دیوار نے ستارہ کی اس جرأت کو حیرانی سے دیکھا۔ ستارہ نے کمال بے نیازی سے ان حیران نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔

ادھر دیوڑھی میں مجاہد کو حسب نسب کے واسطے دیئے گئے۔ دولت کی محرومی سے دھمکایا گیا۔ مجاہد بڑی دیوڑھی میں پھیلی اس مسموم فضاء میں انسانی قدروں کو مرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے پھر بھی کوشش کی اور دیوڑھی والوں کو اونچ نیچ کی تفریق کی دیوار ڈھانے کی ترغیب دی۔ لیکن اس کی ہر آواز دیوڑھی کے در و دیوار سے ٹکرا کر رہ گئی۔ ناچار اس نے ستارہ سے سیول میرج کرلی۔

دوستوں نے ستارہ کے گھر پر شادی کا جشن منایا۔ ستارہ بہت خوش تھی اس کو اس بات کا دکھ کبھی نہیں رہا کہ اس نے شادی کا روایتی جوڑا نہیں پہنا، یا سسرال کو رخصت نہیں ہوئی۔ وہ موجودہ سماج کی سوجھ بوجھ رکھنے والی ذہین لڑکی تھی جس کے پاس فرسودہ نظام کے رواجوں

کی کوئی اہمیت نہیں تھی - ایک دن ستارہ نے سری کانت کو ہنستے ہوئے بتلایا تھا کہ وہ لوگوں کے اخلاقی قدروں کی پرکھ احساس کی کسوٹی پر کس کے کرتی ہے جو اس میں پورا اترتا ہے - وہی اس کے لئے کندن ہے - جیسے اس کا مجاہد اور اس کا دوست سری کانت - اس یاد کے ساتھ سری کانت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی - سری کانت یادوں میں اس طرح گم تھا کہ اس کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ماں آئی اور اس کے قریب بیٹھ گئی - وہ ماں کی آواز پر چونک پڑا "کیا سوچ رہے ہو بیٹا"

"میں ستارہ اور مجاہد کی شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا ماں"

"ہاں! اُس شادی کی کسر دیوڑھی والوں نے اعجاز کی شادی میں خوب پوری کر دی صرف آتش بازی جو چھوڑی گئی وہ دیکھنے کے لائق تھی -"

"کیا کہا ماں! اعجاز نے شادی کر لی؟ اور اس نے مجھے رقعہ بھی نہیں بھیجا"

"کیوں؟ کیا اعجاز اب بھی تم سے خفا ہے؟"

"شاید! وہ پگلا سمجھتا ہے کہ میں نے مجاہد کو شادی کے لئے اکسایا تھا خیر میں کل دیوڑھی جاؤں گا اور اسے شادی کی مبارکباد دے آؤں گا"

سری کانت پھر خیالوں کی دنیا میں گم ہو گیا - وہ دونوں بھائیوں کے کردار کا موازنہ کرنے لگا - بڑا بھائی مجاہد جتنا سیدھا سادا اور منکسر المزاج تھا، چھوٹا بھائی اعجاز اتنا ہی متکبّر اور مغرور - سری کانت کو آج بھی وہ گفتگو یاد تھی جو اس نے ستارہ کے بارے میں کی تھی -

"یہ کیا سوجھا ہے مجاہد بھائی کو؟ تم سمجھاتے کیوں نہیں سری کانت"

اعجاز نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے سری کانت نے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ستارہ تمہیں پسند نہیں؟"

"وہ ہمارے منشی بابا کی لڑکی ہے" اعجاز نے منشی بابا پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ میں نے بھگوت گیتا میں پڑھا ہے کہ آدمی جنم سے نہیں کرم سے چھوٹا بڑا ہوتا ہے۔"

"بڑے نواب اس رشتے کو پسند نہیں کریں گے سری کانت"

ڈیوڑھی کے چھوٹے بڑے اعجاز کے والد کو بڑے نواب کہہ کر پکارتے تھے۔

"تم سمجھاتے کیوں نہیں بڑے نواب کو آخر کیا کمی ہے ستارہ میں؟"

"پھولوں کو چھوڑ کر کانٹوں کے لئے دامن میں جگہ پیدا نہیں کی جاتی سری کانت" اعجاز نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ اس کی گردن غرور سے تن گئی تھی۔

"کیا حق پہونچتا ہے تمہیں یہ کہنے کا؟" سری کانت نے غصے سے پوچھا۔ پھر کہا "ستارہ کا شمار کالج کی ذہین طالبات میں ہوتا ہے پھر بھی ستارہ نے خود کو اعلیٰ اور دوسرے کو ادنیٰ نہیں سمجھا۔ تم نے یہ جواز کہاں سے پیدا کیا کہ خود کو پھول دوسرے کو خار سمجھو۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں والی مثال یاد ہوگی" سری کانت کو اردو سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اردو شاعری بہت شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

"تو یہ خیال ہے جناب کا ستارہ کے بارے میں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ مجاہد بھائی کو کس نے اکسایا ہے۔ میں بڑے نواب کو سب کچھ بتلادوں گا۔

اعجاز نے بھی غصّے کے لہجے میں کہا۔

"مال و دولت سے زیادہ اخلاقی قدریں قیمتی ہوتی ہیں۔ اعجاز اس بات کو سمجھو۔ اور اگر بڑے نواب نے انکار کیا تو میں سمجھونگا انھوں نے ستارہ سے انصاف نہیں کیا"

پھر اس تلخ گفتگو کے بعد اعجاز نے سری کانت سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔

دوسرے دن سری کانت جب بڑی ڈیوڑھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی تو سری کانت نے دیکھا کہ اس وسیع احاطے میں کھڑی وہ ڈیوڑھی بڑی پُر وقار لگ رہی تھی۔ اعجاز کی شادی میں کئے گئے رنگ روغن نے ڈیوڑھی کی خوبصورتی کو نکھار دیا تھا۔ سری کانت کے آنے کی اطلاع پاتے ہی اعجاز دوڑ آیا۔ دونوں دوست پُرانی کدورتوں کو بھلا کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اعجاز بہت دیر تک اپنی شادی کی تفصیلات بتاتا رہا۔ اس کے چچا امریکہ جا کر بس گئے تھے۔ ان ہی کی لڑکی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ بڑے نواب اپنی بھتیجی کو بہت چاہتے تھے شادی کے بعد اس کی بیوی امریکہ واپس چلی گئی تھی۔ جب اس کا ویزا آئیگا تب وہ بھی چلا جائے گا۔

دوران گفتگو ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ دوڑتا ہوا آیا اور اعجاز کے قریب کھڑا سری کانت کو گھورنے لگا۔ پھر وہ واپس اندر بھاگ گیا۔ اس بچے کا ناک نقشہ بالکل ستارہ جیسے تھا۔ سری کانت کے چہرے پر حیرانی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اعجاز نے کہا "یہ مجاہد بھائی کا لڑکا منا ہے"

"تو کیا ستارہ دیوڑھی میں رہتی ہے؟" سری کانت نے فوری سوال کیا۔

"نہیں وہ عورت دیوڑھی میں داخل نہیں ہو سکتی۔ بڑے نواب منے کو بہت چاہتے ہیں۔ اس لئے مجاہد بھائی منے کو یہاں چھوڑ جاتے ہیں"۔

اعجاز کے جملے کی کڑواہٹ نے سری کانت کا ذہن تلخ کر دیا۔ اس نے خاموشی سے وہ کڑواہٹ اپنے حلق کے نیچے اتار لی۔ اس تموشی کے موقع پر وہ اعجاز سے بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ دیوڑھی والے اب بھی اپنے دلوں میں جھوٹی شان اور خود غرضی کے اندھیرے پھیلائے ہوئے ہیں جبکہ باہر کی دنیا تحقیق و تجسس کے میدان میں گامزن ہے۔ یکایک اس فضا میں سری کانت کو گھٹن محسوس ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے اعجاز سے پھر ملنے کا وعدہ کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ اپنے بوجھل دل پر چھائی ہوئی اداسی کو دور کرنے کے لئے سری کانت نے فرحت بخش ہوا کی ضرورت محسوس کی اور اپنی کار تالاب کٹہ کی جانب موڑ دی۔ تالاب کٹہ کے قریب پہنچ کر وہ کار سے اتر پڑا۔ اس نے دیکھا کہ تالاب کٹے کا ماحول بالکل بدل گیا ہے۔ ایک جانب مشہور ہستیوں کے مجسمے کھڑے علاقائی تاریخی دور کی یاد دلا رہے ہیں تو دوسری جانب تالاب کے بڑے حصے کو زمین سے پاٹ کر اس پر فلائی اوور دوڑایا گیا ہے۔ دور تالاب سے پرے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا سنگ مرمر کا مندر اس کے معمار کی عظمت کا پتہ دے رہا ہے۔ مندر سے نکلتی ہوئی روشنی آسمان پر جھل مل کرتے ستاروں کے ساتھ مل کر عجیب سماں پیش کر رہی ہے۔

تالاب پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس سے اٹھتی ٹھنڈی ہوا سری کانت کے دماغ کو فرحت بخش رہی تھی۔ کٹھ کے شور وغل کو پار کرتا سری کانت زمین کے اس خاموش حصہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جس کی عریانیت کو ہرے بھرے سبزے سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ اس نے دیکھا لوگ سطح تالاب کی دلکشی میں کھوئے ہوئے ہیں۔ سری کانت نے سوچا ان میں کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو سطح تالاب کے ساتھ اس کی تہہ میں چھپے خزانے پر بھی غور کرتے ہوں گے۔ اس وقت اس کو ستارہ کا باپ یاد آ گیا جو اپنی بیٹی کو انمول موتی سمجھتا تھا۔

"میری بیٹی انمول موتی ہے سری کانت بابو۔ سوچ رہا ہوں اس کی آئندہ زندگی کیسی ہو گی" ایک دن ستارہ کی شادی کے بعد اس نے کہا تھا۔

"ستارہ کی زندگی خوشیوں سے لبریز ہو گی منشی بابا۔ مجاہد کی محبت اس کی ضامن ہے" سری کانت مجاہد اور اعجاز کی طرح انھیں منشی بابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

"پھر مجھے اس غریبی امیری کی الجھنوں سے ڈر کیوں لگ رہا ہے سری کانت بابو؟"

"امیری غریبی کی الجھن؟ میں سمجھا نہیں منشی بابا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ امیر غریب سب مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ انسان چاہے تو مٹی کے اس گھر میں محبت کا دیا جلا کر اس کو مندر کی طرح پوتر کر سکتا ہے۔ نہ چاہے تو نفرت کی آگ پھیلا کر خود بھی بھسم ہو سکتا ہے۔ ویسے یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ امیری اور غریبی کا تعلق دریا اور ناؤ جیسا ہے۔ کبھی ناؤ دریا پر تو کبھی دریا ناؤ پر"

"اس وقت آپ نے مجھے میرا گاؤں یاد دلایا ہے سری کانت بابو۔ آپ نہیں جانتے میرا ایک گاؤں تھا۔ گاؤں میں ہمارے کھیت تھے۔ ہمارے بیل تھے۔ میری چھوٹی بہن ننھی تھی۔ خوشیوں سے بھرا ہمارا بچپن تھا۔ محبت کرنے والا باپ تھا۔ بُرا ہو اُس قحط کا۔ اُس نے ہماری خوشیاں نگل لیں۔ ہمارے بیل بکے۔ ہمارے کھیت بکے۔ پھر گاؤں کی سرحد کے اِس پار اُس پار منڈلاتے چیل کوؤں نے گاؤں والوں کی نعشوں کو پھاڑ دیا۔ ایک دن اُن نعشوں میں میرے باپ کی نعش بھی پائی گئی تھی سری کانت بابو جس کی آنکھوں کو چیلوں نے نوچ نوچ کھایا۔ اُس دن میں اور ننھی بہت روئے تھے" یہ کہتے ہوئے منشی بابا کی آواز بھرا گئی۔ سری کانت نے اپنا ہاتھ منشی بابا کے ہاتھ پر رکھ کر ان کے دکھ کو بانٹا۔

ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر انھوں نے پھر کہنا شروع کیا "ہماری بے بسی شہر کے امیروں کو راس آئی۔ اولادِ آدم بے دام بکنے لگی۔ میرے چچا نے ننھی کو بیچ دیا۔ اس دن سہمی سہمی ننھی کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو دیا تھا۔ کوئی نہ تھا جس سے میں اپنا دکھ کہتا۔ پھر میں بھی بک گیا۔ بڑے نواب کے والد نے مجھے خریدا تھا۔ میں شہر لایا گیا۔ بڑی دیوڑھی میں رہنے لگا۔ بچپن اور جوانی بڑے نواب کے ساتھ گزری۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے سری کانت بابو۔ انھوں نے مجھے پڑھنا سکھایا۔ میں نے بڑی محنت سے میٹرک پاس کیا اور دیوڑھی کا منشی بن گیا۔"

"پھر آپ نے دیوڑھی کب چھوڑی؟" سری کانت نے پوچھا

"جب میری شادی ہوئی تو میری بیوی کو دیوڑھی میں رہنا پسند نہیں آیا

ہم نے ڈیوڑھی چھوڑ دی۔ ایک چھوٹا سا گھر بسالیا۔ پھر ہماری زندگی میں ستارہ آ گئی۔ ستاروں کی طرح چمکتی آنکھیں لے کر۔ خوشیوں کے دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ ستارہ کی ماں بیمار ہو گئی اور آخر وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں پھر تنہا ہو گیا۔ تب ستارہ ہی میرے۔ لئے سب کچھ بن گئی۔ ستارہ ذہین تھی میں نے عہد کیا کہ میں اس کو خوب پڑھاؤں گا۔ وہ ہر امتحان میں اول آنے لگی۔ اس کی کامیابی کی مئے پی پی کر میں جینے لگا۔ اور اس نشے میں یہ بھول گیا کہ ستارہ جوان ہو گئی ہے۔ ہوں! قسمت کا کھیل دیکھئے سری کانت بابو۔ ستارہ نے شادی کی تو کس سے؟ اسی ڈیوڑھی کے مجاہد بابا سے جس ستارہ کی ماں ہمیں دور لے گئی تھی۔۔۔۔"

منشی بابا کی آواز فضا میں گم ہونے لگی۔ پانی کا ایک قطرہ سری کانت کے ہاتھ پر ٹپکا۔ وہ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا اور سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ وہاں سرمئی بادلوں کا اندھیرا کھیل رہا تھا۔ بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بوند۔ بوند زمین پر آ رہے تھے۔

پلک جھپکتے سری کانت کے قیام کے آٹھ دن گزر گئے۔ وہ مجاہد اور ستارہ سے ملے بغیر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ مجاہد سے خفا تھا کہ جن رشتے داروں نے ستارہ کو اپنایا نہیں تھا مجاہد نے کیسے ان سے میل پیدا کر لیا۔

وقت کا حساب بہار و خزاں کی آمد و رفت سے ہوتا رہا۔ ستارہ یاد رہی۔ بے خبر سری کانت اپنے کام میں مصروف رہا۔ ماں کے خطوط ملتے رہے لیکن ایک دن ماں کے مختصر خط نے اسے چونکا دیا۔ ماں کے خط سے اسے

پتا چلا کہ ماں سے ملے چار سال کا عرصہ بیت گیا ہے اور یہ کہ بیماری نے انھیں بے آس کر دیا ہے۔ خط پڑھ کر سری کانت ماں سے ملنے بے چین ہو گیا۔ وہ وطن لوٹ آیا۔ اس بار رشتے داروں کی بھیڑ میں اُسے ماں کا پیکر دکھائی نہیں دیا۔ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنے اپارٹمنٹ پہونچا۔ سیدھے ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ ماں اپنے بستر پر لیٹی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر ماں کے سینے سے لپٹ گیا۔ ماں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ماں نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹا" اب تو ہو لے آ"

"ہاں ماں! اب تم جلد اچھی ہو جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا"

ماں نے کانپتے ہاتھوں سے سری کانت کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اسکی پیشانی چوم لی۔ سری کانت کی واپسی ماں کے لئے جام صحت بن گئی وہ اچھی ہونے لگی۔ اُس کی صحت سے مطمئن ہونے پر سری کانت کو بڑی دیوڑھی کی یاد ستانے لگی۔ کیونکہ اُسے معلوم ہوا تھا کہ بڑے نواب سخت بیمار ہیں۔ سری کانت کو بڑے نواب کی بڑی شفقتیں یاد آ گئیں۔

دوسرے دن سری کانت کی کار جب بڑی دیوڑھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی تو اُس نے دیکھا کہ دیوڑھی کا رنگ روغن پھیکا پڑ گیا ہے اب وہ دیو احاطے میں کھڑی تنہا دیوڑھی نہیں تھی اس کے اطراف کئی منزلہ عمارتیں کھڑی ہو گئی تھیں جن کی اونچائی نے دیوڑھی کی بلندی کو پست کر دیا تھا۔

دیوڑھی میں چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سری کانت کے قدموں کی چاپ سے ٹوٹنے لگی۔ وہ بڑے نواب کے کمرے کی جانب مڑ گیا۔ بڑے نواب

اپنی قدیم مسہری پر لیٹے کسی خیال میں غرق تھے۔ پاس میں بیٹھا مجاہد ایک خط پڑھنے میں منہمک تھا۔ اس نے چونک کر آنیوالے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرانی اور مسرت کے آثار پیدا ہو گئے "سری کانت" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے نواب بھی غور سے سری کانت کو دیکھنے لگے۔ سری کانت نے جھک کر آداب بجالایا۔ بڑے نواب نے سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

"جی میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی مزاج پرسی کو حاضر ہوا ہوں۔"

"بہت دن خفا رہے بیٹا ہم سے" بڑے نواب نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جی آپ یہ کیا فرما رہے ہیں بڑے نواب۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں" سری کانت مجاہد اور اعجاز کی طرح انھیں بڑے نواب کہا کرتا تھا۔

"یہ ہمارے لئے تمہارا احترام ہے بیٹا جو تمہیں سچ کہنے سے روک رہا ہے۔ اعجاز نے ہمیں سب کچھ بتلا دیا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ ہم نے ستارہ سے انصاف نہیں کیا" بڑے نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ مجاہد چونک کر بڑے نواب کو دیکھنے لگا۔ بڑے نواب کی نظریں دور کہیں کچھ ڈھونڈتی رہیں۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"وقت اور بیماری کے بنائے ہوئے اس قید خانے میں ہم اکیلے رہ جاتے

بیٹا اگر ستارہ نے ہمارے بڈھے بیٹے کو ہمارے پاس نہ بھیجا ہوتا۔ یہ اُس کا بڑا پن تھا۔ تم نے سچ کہا تھا کہ ہم نے ستارہ سے انصاف نہیں کیا"

مجاہد کے لئے وقت چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ وہ سانس روکے بڑے نواب کو سن رہا تھا۔ اس کی حیرانی سے سری کانت نے اندازہ لگایا کہ ستارہ کا ذکر بڑے نواب کے ہونٹوں پر پہلی بار آیا تھا۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگا "کیا میری موجودگی نے بڑے نواب کو ستارہ کی یاد دلائی ہے؟ کیا بڑے نواب کے غرور کا پودا وقت کی گرمی سے جھلس گیا ہے کیا فطرتِ خوابیدہ کروٹ لے رہی ہے؟ کیا عقل کے چراغ روشن ہو رہے ہیں؟"

بڑے نواب کی آواز پر مجاہد اور سری کانت اپنی اپنی خیالی دنیا سے لوٹ آئے اُن کے چہروں پر پھیلی حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بڑے نواب نے کہا

"بیٹا مجاہد آج شام ستارہ کو ہمارے پاس ضرور لانا۔ کہنا ہم نے بلا لیا ہے" یہ کہہ کر بڑے نواب نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُن کے چہرے پہ نقاہت چھا گئی گویا ان جملوں کی ادائیگی نے اُن سے ساری توانائی چھین لی تھی۔

مجاہد کا چہرہ خوشی کی غمازی کر رہا تھا۔ وہ بڑے نواب سے اجازت لیکر سری کانت کا ہاتھ تھامے باہر چلا آیا۔ دونوں ایک دوسرے کے چہروں پہ اُبھرتے سوال پڑھ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجاہد نے کہا "تم جب بھی ملتے ہو مجھے خوشیاں دیتے ہو سری کانت"۔

سات سال کے لمبے عرصے کے بعد سری کانت ستارہ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ وہ دونوں آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ مجاہد کو بے چین پا کر

ستارہ نے پوچھا۔

"بڑے نواب کیسے ہیں مجاہد؟"

"آج وہ بہت بے چین تھے ستارہ ۔ اعجاز کے خط نے ——

اعجاز کے خط نے انھیں دھکا پہونچایا ہے"۔

"کیوں؟ کیا لکھا ہے اعجاز نے؟"

"اعجاز کی بیوی نے طلاق لے لی ہے۔"

"کیا کہا؟" ستارہ حیرانی سے سری کانت کو دیکھنے لگی ۔ "بڑے نواب کی چہیتی بھتیجی نے طلاق لے لی ہے آخر کیوں؟" ستارہ نے چبھتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"اعجاز نے لکھا ہے کہ اُس کی بیوی نے وہاں کے کسی آدمی سے دوستی بڑھا لی تھی۔ بس اس بات کو لیکر دونوں میں جھگڑا ہوا کرتا تھا" مجاہد نے اداس لہجہ میں جواب دیا۔

ستارہ کے ہونٹ طنز سے مسکرا اُٹھے ۔ اس نے کہا "یہ سچ ہے وقت کا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے۔ طلاق دو دلوں میں پلنے والی نفرت کا نتیجہ ہے۔ اعجاز کا طلاق کھوکھلے نظام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے"۔

ستارہ کی سنجیدگی کو غائب ہوتے دیکھ کر سری کانت جان گیا کہ صبر کا بند ٹوٹ رہا ہے اس نے کہا

"نہیں ستارہ ۔ یہ طنز یہ غصہ تم کو زیب نہیں دیتا۔ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو تمہارا عمل بھی عام عورتوں جیسا نہیں ہونا چاہیئے۔ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو دیکھو وہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے"۔

ستارہ کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجاہد نے کہا۔ "ستارہ بڑے نواب نے تمہارے لئے پیام بھیجا ہے۔ تمہیں بلا بھیجا ہے۔ آج شام چلو گی نا میرے ساتھ"

ستارہ کے طنز سے پھیلے ہوئے ہونٹ ایکدم سکڑ گئے۔ آنکھوں کی چمک دھندلا گئی۔ ایک پل کے لئے آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور پلکوں میں جذب ہو گئے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر سری کانت نے سوچا کہ ماضی کے درد و الم کی ٹیسیں ستارہ کے دل و دماغ میں کہیں چھپی بیٹھی ہے جس کو چھیڑ کر مجاہد نے اس کے سکون و قرار کی دنیا میں ہلچل مچادی ہے۔ مجاہد نے بھی اس کیفیت کا اندازہ لگایا اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ انکار نہ کر بیٹھے کہنے لگا۔

"ستارہ بڑے نواب اندر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ انھیں ہماری ضرورت ہے۔ انھوں نے ہمیں بلایا ہے۔ ہمیں وہاں جانا ہے۔ آج شام جشن بھی ہوتا ہے"

اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ستارہ نے کہا "ہاں بڑے نواب کو ہماری ضرورت ہے۔ میں ان کی امید کی آخری کرن ہوں۔ میں اس روشنی کو گل ہونے نہیں دونگی"

یہ سن کر مجاہد اور سری کانت نے اطمینان کی سانس لی۔ سری کانت نے کہا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی ستارہ تم اپنے رگ و پے میں اترتے کرب کو فرض کی چادر میں چھپائے زندگی کے راستے پر گامزن رہوگی"

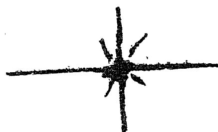
پھر شام آئی۔ وہ شام بڑی پر فضا اور خوشگوار تھی۔ چاند کا نور

آسمانی وسعتوں سے نکل کر زمین کے گوشے گوشے کو منور کر رہا تھا۔ سری کانت کی کار پھر ایک بار بڑی ڈیوڑھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے سے پہلے ستارہ اور مجاہد نے سری کانت کا شکریہ ادا کیا۔ اور اسے خدا حافظ کہا ——

سری کانت ستارہ کو نئی محبت اور نئے یقین کے ساتھ منے کی انگلی پکڑے مجاہد کے قدم بہ قدم چلتے بڑی ڈیوڑھی میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔

# فراخ دل کون ؟

زندگی صرف اک انعام نہیں ہے آذر
زندگی قرض بھی ہے حق بھی ہے بیگار بھی ہے



تمام رات بادل ہلکی پھوار کی شکل میں برستے رہے۔ اب دن شروع ہو چکا تھا پھر بھی کارگاہِ ہستی کے تمام گوشے سورج کی تابناک کرنوں سے محروم تھے۔ چاروں طرف ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ پتوں کا ٹکراؤ فضا میں موسیقی بکھیر رہا تھا۔ دن شروع ہوتے ہی حرکت و عمل کی دنیا آباد ہو گئی۔ ماحول میں پیدا ہونے والی گہما گہمی کو موسم کی دلفریبی روک نہ سکی۔ محنت و کاوش کو اپنا دستورِ حیات بنانے والے لوگ تلاشِ معاش کی فکر میں گھروں سے نکل پڑے۔

میں کھڑکی کے قریب کھڑی اپنی شوقِ باغبانی کا ثمر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کے باہر کی زمین کا چھوٹا سا خطہ سبز مخمل کے فرش میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے کناروں کے گوٹ پھولوں کے زیور سے سج دھج کر آراستہ ہو گئی تھی۔ کھڑکی کے چھجے سے چمٹی چنبیلی کی بیل خوشبو سے دماغ کو معطر کر رہی تھی کہ یکایک باہر کی گھنٹی بجی میں ہال میں چلی آئی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے روشن اور اس کا لڑکا رحیم کھڑے تھے۔

روشن کو دیکھ کر باورچی خانہ کی سنک میں پڑے برتن میرے دماغ میں جھنجھلانے لگے۔ ٹوکری میں دھری ترکاری کانوں میں سرگوشی کرنے لگی۔

میں ایک طرف ہٹ گئی اور روشن کے لئے راستہ چھوڑ دیا ۔

"بی بی جی ۔ یہ رحیم کل سے آپ کی رٹ لگائے ہوئے ہے اسی لئے حاضر ہوئی ہوں" روشن نے کہا ۔

میں نے رحیم کا گال پیار سے تھپتھپایا ۔ روشن کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی ۔ پھر باورچی خانے میں جھانکا ۔ جھوٹے برتنوں پہ نظر پڑتے ہی اپنی عادت کے مطابق کمر کس لی ۔ اسے کام میں مصروف پاکر میں نے اطمینان کی سانس لی ۔ کھانے کی میز پر مٹھائی کا ڈبہ دھرا تھا ۔ کچھ مٹھائی باقی رہ گئی تھی ۔ وہ میں نے رحیم کو دے دی ۔ رحیم مٹھائی کھانے میں مصروف ہو گیا ۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی ۔ اور بستر پر دراز ہو گئی ۔ اب میرے ذہن کے پردے سے موسم کی رنگینیاں ڈھل چکی تھیں اور روشن کی زندگی منظر ابھر رہی تھی ۔

آج سے تین سال پہلے روشن کو نوکری کی تلاش تھی لیکن اُسے نوکری نہیں مل رہی تھی ۔ لوگ تین ماہ کے رحیم کو روشن کی گود میں کلبلاتے دیکھتے تو "ہمیں نوکر نہیں چاہیئے" کا روکھا سا جواب سُنا دیتے ۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کی دوڑ میں انسان کو اتنی مہلت کہاں کہ وہ دوسروں کی مصیبتوں کے جھٹکوں کو محسوس کر سکے مجھے اس وقت بھی نوکرانی کی اتنی ہی تلاش تھی جتنی کہ آج ۔ اگر روشن کے دو بچے ہوتے تو بھی میری ضرورت پر بھاری نہ ہوتے ۔ اسی لئے جب میرے ایک رشتہ دار نے روشن کی سفارش کی تو میں فوراً راضی ہو گئی ۔ روشن میری توقع سے زیادہ ہی محنتی نکلی ۔ اس نے بہت جلد گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا ۔ اس کا بیٹا رحیم میری دونوں بیٹیوں کے لئے کھلونا بن گیا ۔ کالج سے واپس آنے کے

بعد وہ کچھ دیر اس کو اپنی گودی میں لئے رہتیں۔ میرے لئے بھی فرصت کے اوقات نکل آئے۔ اُن اوقات میں روشن کو مصروف دیکھ کر میں رحیم کی دیکھ بھال کر لیا کرتی۔ وہ بھوک سے بلبلاتا تو دودھ شیشی میں ڈال کر اُسے پلاتی۔ پیاسا ہوتا تو پانی دیتی۔ بستر گیلا کر کے چلانے لگتا تو روشن کا کام خود سنبھال لیتی اور وہ رحیم کو چپ کرا کے چلی جاتی۔ اس طرح رحیم کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے میں روحانی مسرت محسوس کرتی۔ ایسے موقعوں پر میری عقیدت بھری نظریں مدر ٹریسا کی جانب مڑ جاتیں جو لوگوں کے عقل و شعور کیلئے چراغ جلا رہی ہیں اور خود محبت و احترام کا پیکر بن گئی ہیں۔

روشن کا لہجہ دکنی نہیں تھا اور نہ ہی وہ دکنی عورتوں کی طرح ہاتھ کو کٹورا بنا کر سلام کیا کرتی تھی۔ اس کی وجہ مجھے اس دن معلوم ہوئی۔ جب اس نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں بتلایا۔

"بی بی جی۔ جب بھوپال میں زہریلی گیس پھیلی تھی میں وہیں تھی۔ ہمارا گھر اُس فیکٹری سے بہت دور تھا۔ اسی لئے گیس ہمارے علاقے تک نہ پہنچ پائی لیکن سڑکوں پر گلیوں میں گھروں میں پھیلی موت کی خبریں ہمیں ملتی رہیں۔ میرا اختلاج بڑھتا گیا کیونکہ ان دنوں میں ماں بننے والی تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد ہمارے گھر میں بہار آ رہی تھی۔ جب ہمارے پڑوسی بھوپال چھوڑ کر دلی جانے لگے تو ہم بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ پرایا شہر کتنے دن رہتے۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو واپس بھوپال چلے آئے۔ میرا شوہر لاری چلاتا تھا۔ پیسوں کی ضرورت بڑھ گئی تو وہ دن رات لاری چلانے لگا۔ بی بی جی وہ

رات بہت کالی تھی جس رات اُس کی لاری ایک کھڈ میں جا گری۔ کھڈ بہت گہرا تھا۔ وہ بچ نہیں پایا۔ جب اُس کی لاش کھڈ سے باہر نکالی گئی تو اُس کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ لاری کے شیشے نے کئی جگہ سے اُس کا چہرہ کاٹ دیا تھا۔ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ چہرے اور جسم پر خون کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ لاش کی یہ درگت دیکھ کر میں برداشت نہ کر پائی اور اپنا سینہ پیٹنے لگی بس اُسی رات وقت سے پہلے رحیم پیدا ہوا۔"

یہ کہہ کر روشن خاموش ہو گئی اس کے غمگین واقعہ کو سُنکر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے پوچھا۔

"پھر اس شہر میں کیسے آئیں"

کہنے لگی "میری ساس رحیم کو منحوس سمجھتی تھی۔ جھگڑا کرتی رہتی۔ پھر ایک دن مجھے گھر سے نکال دیا۔ پاس پڑوس والوں نے میری مدد کی۔ میرے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا اور میں یہاں اپنی بہن کے پاس چلی آئی۔ بہن کا اپنا گھر ہے۔ اس کے بال بچے ہیں۔ قسمت کی ٹھوکروں نے ایک بات مجھے سکھا دی ہے بی بی جی کہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہیئے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ محنت مزدوری کرونگی لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤنگی۔"

سامنے کی دیوار پر سے چیونٹیوں کی سرخ لکیر نے میرا ذہن متوجہ کر لیا —— چیونٹیاں! اس موسم میں! میں حیران ہو گئی پھر سوچنے لگی کتنی چھوٹی سی جان ہے چیونٹی کی اور کتنی محنت کرتی ہے وہ۔ لیکن اپنی کسی ہم جنس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ انسانی غیرت کیلئے یہ کتنا بڑا تازیانہ ہے۔

جب روشن کو ہمارے پاس رہتے ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا تو اس نے میرے اعتماد کی ساری سیڑھیاں عبور کر لیں - اب گھر میں کنجیوں کا گچھا بھول جانے پر مجھے دفتر میں وحشت نہیں ہونے لگی -

میری دونوں لڑکیوں کی شادی ان کے امتحانات کی وجہ سے رکی ہوئی تھی - جیسے ہی انھوں نے امتحانات کے پرچے پورے کئے گھر میں شادی کے ڈھول بجنے لگے - روشن نے مہمانوں کی دیکھ بھال کا کام سنبھال لیا - میں تم زیور کپڑا اور ضروری سامان خریدنے میں مصروف ہو گئی - میں نے روشن کے لئے بھی ہلکا پھلکا زیور زرین گوٹ کی ساڑی اور رنگین چوڑیاں خریدیں - ابتدا میں روشن نے زیور اور چوڑیاں پہننے سے انکار کر دیا - میں نے اصرار کیا تو وہ راضی ہو گئی - خدا خدا کر کے لڑکیاں اپنے سسرال سدھاریں - شادی کا ہنگامہ ختم ہوا - گھر میں خاموشی سناٹا پھیل گیا - میں پھر دفتر کے کام میں مصروف ہو گئی -

اب روشن کے پاس کام کم اور فرصت کے اوقات زیادہ تھے - اس نے لڑکیوں کی شادی میں پہنے زیور اور چوڑیوں کو بھی نہیں اتارا - صبح و شام اپنے بال سلجھاتی رہتی - کبھی رنگین ساڑی پہنتی کبھی پھولدار شرٹ شلوار - شاید اس کے دل میں جوانی کی امنگیں پھر سے انگڑائیاں لینے لگی تھیں - اس خوشگوار تبدیلی سے خوش ہو کر میں نے کہا -

" روشن تم جوان ہو - بناؤ سنگھار کرنے سے اچھی لگتی ہو کسی بھلے مانس سے نکاح کیوں نہیں کر لیتی ؟ "

روشن پھیکی ہنسی ہنسنے لگی "نکاح بی بی جی! مجھے تو رحیم کے ساتھ نوکری بھی نہیں مل رہی تھی"

"رحیم کو میں رکھ لیتی ہوں۔ اب تو وہ بڑا بھی ہو گیا ہے" میں نے اطمینان دلایا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری پھر کہا "نہیں بی بی جی۔ مجھ سے نکاح کوئی نہیں کرے گا۔ دنیا میں بن بیاہی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

پھر میں نے روشن کی آنکھوں میں غبارِ حسرت کے بگولے اٹھتے دیکھے۔

اس طرح روشن کو سمجھتے دیکھتے کچھ عرصہ بیت گیا۔ وہ دن چھٹی کا تھا۔ روشن اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ ہمارے محلہ میں رہنے والی ڈاکٹر شانتا مجھ سے ملنے چلی آئی۔ اس کا ہمارے محلہ میں کلینک بھی تھا۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے بہت کم ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ شانتا کو ہال میں بٹھا کر میں چائے تیار کرنے چلی گئی۔

"روشن کہاں ہے؟ کیا وہ ابھی سے چھٹی پر چلی گئی؟" ہال میں بیٹھی شانتا نے پکار کر پوچھا۔

"ابھی سے کیا مطلب؟" میں نے باورچی خانے سے آواز لگائی۔

"کیوں؟ اس نے بتلایا نہیں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔"

چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچ گئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا وہ تمہاری کلینک پر آئی تھی؟"

"ہاں آئی تھی اپنے آدمی کے ساتھ - وہی نکڑ کا چائے والا"

شانتا روشن کی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی اسی لئے میں نے روشن کے ماضی پر پردہ پڑا رہنے دیا۔ شانتا میرے دماغ کو حقیقت کے عذاب میں مبتلا کر کے چلی گئی میں غصہ کی زنجیر میں بندھی کسمساتی رہی - پھر جیسے جیسے وقت گذرتا گیا - کڑیاں الگ ہو کر گرتی گئیں - میرا غصہ سرد ہو گیا - لیکن میں نے عہد کر لیا کہ اب روشن کو اپنے پاس نہیں رکھونگی -

دوسرے دن روشن آئی لیکن اس کے ساتھ رحیم نہیں تھا - وہ جلدی میں تھی کہنے لگی "بی بی جی مجھے ایک ہفتہ کی چھٹی چاہیئے - میری بہن بہت بیمار ہے"

"بہن کو کیوں بیمار ڈال رہی ہو - کہتی کیوں نہیں کہ چھٹی تمہیں چاہیئے - کل ڈاکٹر شانتا آئی تھی مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے تم جا سکتی ہو ہمیشہ کے لئے - مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے" یہ کہتے کہتے میری آواز غصہ سے تیز ہو گئی -

روشن سکتے میں آ گئی - بت بنی کھڑی رہی - پھر آہستہ سے کہا "مجھے معاف کر دیجئے بی بی جی اب یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اس عمر میں دھوکا کھا گئی - میں جا رہی ہوں - خدا حافظ"

روشن کے چلے جانے کے بعد نئے نوکر کی تلاش شروع ہو گئی لیکن بے سود لگتا تھا نوکر ہمارے شہر سے غائب ہو گئے ہیں - اس درمیان روشن دو بار آئی - ہر وقت یہی کہتی "بی بی جی یہ رحیم آپ کو بہت یاد کرتا ہے" لیکن میں نے نہ تو رحیم پر رحم کھایا اور نہ اس زہر کے پودے کے بارے میں دریافت

کیا جو روشن کی زندگی میں اُگ آیا تھا۔ شاید اُس نے اسے اکھاڑ پھینکا تھا۔

روشن کی زندگی کی ورق گردانی کرتے کرتے مجھے رادھیکا کی بہو یاد آگئی پچھلے سال رادھیکا نے اپنے اکلوتے بیٹے چندر کی شادی بڑی دھوم دھام سے منائی تھی۔ بہو تعلیم یافتہ تھی۔ اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ رادھیکا بہت خوش تھی۔ جب میں رادھیکا سے ملنے گئی تو اس نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔

"اب آئی ہو ہمارا حال پوچھنے؟"

"کیوں؟ خیر تو ہے۔ بہو کیسی ہے؟"

"نام مت لو اس کلموہی کا۔ کمبخت نے ہمیں جیل بھیج دیا تھا" رادھیکا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

میں حیران رہ گئی "کیا کہہ رہی ہو رادھیکا؟ تفصیل تو بتاؤ"

"کیا کہوں۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک تو وہ کمبخت بہت خوش تھی پھر ایک دوپہر جب میں اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی تو اس کلموہی کے چیخوں سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر بھاگتی ہوئی ہال میں پہنچی دیکھا شعلوں میں لپٹی وہ زمین پر لوٹ رہی ہے۔ اس کی چیخیں سن کر محلے والے بھی جمع ہو گئے۔ پھر ہم نے جلدی سے اس کو ایک کمبل میں لپیٹا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت کچھ پوچھنے کے قابل نہ تھی۔ اس کو لے کر ہم دواخانہ پہنچ گئے اور وہیں سے تمہارے جیجا جی اور بہو کے گھر فون پر اطلاع دی"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر پولیس آئی۔ بہو کا بیان ہوا۔ اس نے لکھوایا کہ اس حادثے کی وہ خود ذمہ دار ہے۔"

"اس نے کوئی وجہ نہیں بتلائی۔؟"

"نہیں اس وقت تو نہیں بتلائی۔ پھر شام ہوتے ہوتے اُس کے ماں باپ آگئے۔ سارے دن کی دوڑ دھوپ نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ بہو کو اُس کے ماں باپ کی نگرانی میں چھوڑ کر ہم گھر چلے آئے لیکن تمام رات جاگتے رہے اور سوچتے رہے کہ بہو نے ایسا کیوں کیا۔؟

صبح میں نے بہو کے ماں باپ کیلئے کھانا تیار کیا۔ تمہارے چچا جی بازار سے سامان لانے چلے گئے۔ چندر دفتر میں چھٹی کی درخواست دینے گیا اتنے میں پولیس ہمارے گھر پہنچ گئی۔ ہم پہ یہ الزام تھا کہ ہم نے بہو کو جلا کر مارنے کی کوشش کی۔ پھر ہم گرفتار ہو گئے۔"

"لیکن بہو نے تو الزام اپنے سر لے لیا تھا" میں نے کہا۔

"معلوم ہوا کہ بعد میں اُس بدمعاش نے اپنا بیان بدل ڈالا تھا شاید ماں باپ کے بہکانے پر اُس نے ایسا کیا تھا نتیجہ تو ہمیں بھگتنا پڑا۔ ہمارے ایک رشتے دار جو وکیل بھی ہیں ہم سے ملنے جیل آئے۔ ہم نے انھیں پوری داستان سنائی اور منت کی کہ وہ یہ کیس ہماری جانب سے لڑیں۔ وہ راضی ہو گئے لیکن تب تک بہو کوما میں چلی گئی تھی۔ اُسے پھر ہوش نہیں آیا اور وہ اپنی حالت میں مر گئی۔"

یہ تو بہت بُرا ہوا۔ پھر کیا ہوا؟

"ہم جیل کو اپنی پچھلی زندگی کے کرموں کا پھل سمجھ کر مایوس ہو گئے تھے۔
لیکن ہمارا رشتے دار آخر وکیل بچہ تھا۔ اُس نے دواخانے میں بہو کی رپورٹوں کی چھان
بین شروع کردی۔ پہلے دن کی رپورٹ غائب تھی بس وہ اُسی کے پیچھے پڑ گیا۔ وہاں
کے عملے کو ڈرایا۔ دواخانے کی سپرنٹنڈنٹ کو دھمکایا تب کہیں جا کر وہ رپورٹ
برآمد ہوئی۔ اس طرح ہماری رہائی ہوئی"

"کیوں؟ کیا لکھا تھا رپورٹ میں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہی کہ وہ کلموہی شادی سے پہلے ہی ماں بن گئی تھی"۔

یہ سُن کر میں پلک جھپکانا بھول گئی ذہن اتنے بڑے دھوکے کو قبول کرنے
تیار نہیں تھا۔

پھر اس یاد کے ساتھ میں رادھیکا کی بہو کا موازنہ رُوشن سے کرنے
لگی۔ دونوں کے گناہ کا پیمانہ ایک لیکن زندگی کا لباس الگ الگ۔ ایک علم
سے آراستہ دوسری اس سے بے بہرہ۔ ایک تہذیب کی گود کی پروردہ۔ دوسری
تہذیب سے ناآشنا۔ ایک اپنے فعل کے لئے معاشرے کو جواب دہ۔ دوسری
معاشرے کے لئے بے معنی۔ اسی لئے ایک نے خودکشی کرلی اور دوسری نے اپنے جذبات
کے دھارے کو موڑ دیا۔

اُس واقعہ کے بعد رُوشن جب بھی آئی شرمساری کی ہلکی سی نقاب اوڑھے
آئی جو اس بات کی مترادف ہے کہ وہ آئندہ ایسی لغزش سے باز رہے گی۔ شاید
اُس بے راہ روی کے بعد اس کے جذبات سو گئے تھے۔

یہ سوچتے سوچتے میں ایک دم بستر پر اٹھ بیٹھی کیونکہ میرا ضمیر مجھ سے

پوچھ رہا تھا۔

"اب روشن کے لئے دل میں یہ نرم نرم گوشے کیوں؟ کیا نئے نوکری کی تلاش ناکام ہو گئی ہے۔؟ کیا تم کام کرتے تھک گئی ہو؟ کیا تمہیں تلاش کی ضرورت ہے؟"

"ہاں مجھے روشن کی ضرورت ہے" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"تو پھر کہہ دو روشن سے" ضمیر نے حکم دیا۔

"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔ تمہاری سبکی ہوگی۔ یاد ہے تم نے دوبار اُسے لوٹا دیا تھا" انا نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

"جب ضرورت ہے تو پھر کہنے میں سبکی کیسی؟" ضمیر نے سوال کیا۔

"ضرورت اس کو بھی ہے تبھی تو آئی ہے اُسی کو کہنے دو" انا نے جواب دیا۔

"تم تو اخلاق کے اصولوں سے واقف ہو مفاد پرستی کی سطح سے بلند ہو جاؤ کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرو" ضمیر نے جھنجھوڑا۔

"مصلحت سے کام لو ورنہ وہ سر چڑھ جائیگی" انا نے رائے دی۔

"مصلحت اور روشن کے ساتھ!" ضمیر نے قہقہہ لگایا۔ "تو پھر تم گوئی کا ڈھنڈورا پیٹنا چھوڑ دو۔ اصولوں کے پابند ہونے کا ڈھونگ نہ رچاؤ" ضمیر نے طعن سے کہا۔

ضمیر و انا کی کشمکش چلتی رہی۔ پھر ضمیر نے اس زور سے ٹھوکا لگایا کہ میں انا کو پیچھے چھوڑ کر ضمیر کی آواز پہ آگے بڑھ گئی۔

روشن برتن پکچین سے صاف کر رہی تھی رحیم مٹھائی ختم کر چکا تھا۔ جب مجھے دیکھا تو دوڑتا ہوا آیا اور میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے پیار سے اس کے دونوں گال تھپتھپائے اور فراخدلی سے کام لیتے ہوئے روشن سے کہا۔

"روشن کہیں کام کر رہی ہو۔ اگر بے کار ہو تو رک جاؤ"

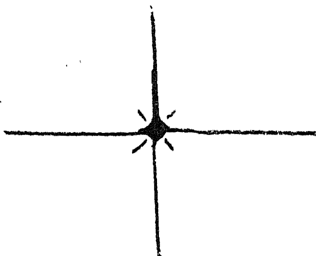
"روشن کی بھتیجی نکل آئی۔" بی بی جی میں وکیل صاحب کے ہاں کام کر رہی ہوں تنخواہ بھی مجھے زیادہ مل رہی ہے۔ لیکن بی بی جی میں وکیل صاحب کا گھر چھوڑ دوں گی میں آپ کے لئے کام کروں گی میرے رحیم کو جو پیار آپ دیتی ہیں نا وہ کوئی نہیں دیتا۔ پھر بی بی جی۔ آپ کا مجھ پر احسان ہے۔ آپ نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب کوئی نوکری دینے تیار نہیں تھا"

میں حیران کھڑی روشن کو سنتی رہی۔ وہاں نہ منہ میں انا کی لگام تھی اور نہ ضمیر کے کچوکے۔ قلب و ضمیر کی ایک ہی آواز روشن کے منہ سے بے ساختہ نکل رہی تھی۔

— —

# سچ کا دُکھ

میں کربلا کے خوں کا مجاور نہیں مگر
چہرے پہ میرے شامِ غریباں کا عکس ہے



**بجلی** بند ہونے کی وجہ سے دیوان خانے کی چھت کو لگا ہوا پنکھا کسی چوراہے پر کھڑے ٹرافک پولیس کی طرح ہاتھ پھیلا کر ٹھہر گیا حامد صاحب نے ایک نظر پنکھے پر ڈالی اور اخبار رکھ دیا۔ پاس کی میز پر رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور اسے کھول کر ایک اچٹتی سی نظر دوڑائی۔ آج ان کا جی پڑھنے میں نہیں لگ رہا تھا۔ مور کا پر جو وہ کتاب میں نشانی کی طور پر استعمال کرتے تھے، ہاتھ میں لے کر گھماتے رہے۔ کچھ دیر کے لئے پر کی چاندی جیسی تیلی اور اس پر بنے سنہری اور زمردی ہالوں میں کھوئے رہے۔ جب اس پر کے لطیف رنگوں سے ان کی دلچسپی کم ہونے لگی تو انھوں نے میز پر سے اخبار اٹھالیا اور اس خبر کو پھر سے پڑھنے لگے جس کے بعد اخبار کے صفحات ان کی نگاہوں میں قرطاس سادہ ہوگئے تھے۔

"اہم اور سرگرم نکسلائیٹ نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس نے بتلایا کہ پارٹی میں ڈسپلن شکنی اور ملک کے فلاح و بہبود کے لئے کام نہ ہونے سے مایوس ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا ہے"۔

اس اطلاع نے حامد صاحب کے غموں سے بھری یادوں کے کواڑ کھول دیئے جس کی دہلیز پر کھڑا تھا وہ نوجوان جو انھیں کالونی کے کالج کے قریب سے گزرتی

سڑک پر ملا تھا اور جس نے ان کے دل و دماغ کو کربِ مرگ میں مبتلا کردیا تھا۔

حامد صاحب سروس کمیشن میں ویجلنس آفیسر تھے۔ چار ماہ پہلے ان کے محکمہ نے چار سو گزیٹیڈ جائیدادوں کے لئے امیدواروں سے درخواستیں منگوائی تھیں۔ ریاست میں بیروزگاری مہلک مرض کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بے کاری سے نوجوانوں کے دل کی اُپج پر ناامیدی اور مایوسی کی اوس پڑ گئی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک لاکھ سے زائد درخواستوں کا دفتر میں ڈھیر لگ گیا۔

غرض جب ان امیدواروں کا اسکریننگ ٹسٹ ہوا تو حامد صاحب نے اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ کمپیوٹر روم میں داخل ہونے سے پہلے انھوں نے اپنے جوتے اتارے جیسے وہ کوئی مقدس کمرے میں داخل ہو رہے ہوں۔ ان کے کرسی سنبھالتے ہی وہاں کا عملہ حرکت میں آگیا۔ مہر بند جوابی پرچہ جات کے بنڈل کھلے۔ رجسٹر میں بنڈل کا کوڈ نمبر درج ہوا۔ جوابی پرچوں کی گرد صاف کی گئی پھر انھیں آپٹیکل مارک اسکانر کے اِن پُٹ میں جمادیا گیا۔

ایر کنڈیشنٹ سے نکلتی سرد لہریں وہاں کام کرنے والوں کے جسموں کو کپکپاتی رہیں۔ ان لہروں کو اپنے جسم کی گرمی میں جذب کرتے ہوئے کمپیوٹر پروگرامر نے کرسی سنبھالی اور pass word کی Key پر اپنی انگلی رکھ دی۔

پرچے اِن پُٹ سے نکل کر آؤٹ پُٹ میں جمع ہوتے رہے۔ اس طرح جوابی پرچوں کا لکھا فلاپی ڈسک پر محفوظ ہوتا رہا۔ کئی دن یہ کام چلتا رہا

جب سارے امیدواروں کا اعمال نامہ خلائی ڈسک پر محفوظ ہو گیا تو دوسری نوعیت کا کام شروع ہوا۔ کمپیوٹر نے پھر ایک بار حیرت زدہ تیزی کے ساتھ جوابی حل کے مطابق جوابوں کو جانچنا شروع کیا۔ حامد صاحب بیٹھے کمپیوٹر کی صلاحیتوں کے بارے میں سوچتے رہے۔ اس وقت انھیں ایک عظیم ہستی کا قول یاد آیا۔

"انسان نہیں جانتا کہ ایک بڑا عالم اس میں سمایا ہوا ہے۔ اور انسان کا نقطۂ ارتقاء تک پہونچنا اس کی قوت اختیار کے بہترین استعمال پر ہے"۔

غرض اسکریننگ ٹسٹ کی چھلنی میں چھن کر جو امیدوار باہر آئے وہ ابھی خود کو خوش قسمت کہلانے کے لائق نہیں تھے۔ کیونکہ انھیں ایک اور اصل امتحان کے پل صراط پر سے گزرنا تھا۔ جب یہ امتحان بھی ختم ہوا تو حامد صاحب کی نگرانی میں ان امیدواروں کے اعمال نامے پھر سے ایکبار کمپیوٹر کی ترازو میں تلنے لگے اور ان کے حاصل شدہ نمبرات سے تدریجی فہرست تیار ہوئی۔ ابھی ان جفاکشوں کا زبانی امتحان باقی تھا۔ امیدوار سرکاری محکموں کو دنیاوی جنت سمجھتے ہیں چنانچہ زبانی امتحان کے بعد چار سو مستحق امیدوار دنیاوی جنت کے لئے چن لئے گئے۔

حامد صاحب اپنے کیبن میں بیٹھے دفتری کام میں مصروف تھے کہ ایک صاحب داخل ہوئے ساتھ میں ایک نوجوان بھی تھا۔

"پہچانا مجھے؟" اُن صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

" ناصر تم!" کہتے ہوئے حامد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ہنستے ہوئے کہا۔
" بھائی تمہیں پہچانتا کیسے نہیں۔ بس یہ تمہاری لمبی ریش میری قوت شناخت
درمیان آ رہی تھی"۔
ناصر صاحب بھی مسکرائے اور مقابل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
" یہ میرا لڑکا شہریار ہے۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لئے منتخب ہوا ہے
ہم نوٹس بورڈ پر اس کا نمبر دیکھ کر آ رہے ہیں"۔ ناصر صاحب کا چہرہ فرطِ مسرت سے
رہا تھا۔
حامد صاحب نے اپنے جھینپے سے "اچھا" کہا۔ پھر خوش ہو کر شہریار سے مخاطب
ہوئے۔
" بیٹا مبارک ہو تمہیں معلوم ہے تم نے اس مسابقتی دوڑ میں ہزاروں امیدوار
پیچھے چھوڑا ہے۔ مبارک ہیں تمہارے وہ استاد جنھوں نے تمہاری قابلیت
جِلا دی ہے"
فاخر باپ نے کہا "تمہیں معلوم ہے اس نے ہمارے گاؤں کے اسی اسکول
کالج میں تعلیم پائی ہے جس میں ہم اور تم پڑھا کرتے تھے"۔
حامد صاحب نے جواب دیا " میں نہیں جانتا کہ ہمارے گاؤں کے اسکول
کالج نے کتنے ہونہار سپوت پیدا کئے ہیں لیکن بلاشبہ تمہارا بیٹا اُن میں
ایک ہے"۔
ناصر صاحب کچھ دیر اپنے دوست کے چہرے پر نظریں جمائے رہے
پوچھا۔

"حامد۔ کبھی گاؤں تمہیں یاد آتا ہے"؟

حامد صاحب کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے پھر کہا "میں گاؤں کو کبھولا ہی کب ہوں۔ اس کی یاد میرے دل میں ہمیشہ کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ اس کی مٹی کی سوندھی خوشبو اب بھی میرے مساموں میں محفوظ ہے"۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں گاؤں چھوڑے! تم نے گاؤں کو پلٹ کر ہی نہیں دیکھا" ناصر صاحب نے شکایتاً کہا۔

حامد صاحب کیا جواب دیتے بس خاموش بیٹھے رہے ناصر صاحب ہی نے خاموشی کو توڑا اور پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ شہریار کے رجوع ہونے کے آرڈر کب تک جاری ہو جائیں گے"۔

"ہم نے یونٹ آفیسروں کو منتخب شدہ امیدواروں کی فہرست بھیج دی ہے بہت جلد اسی محکمے سے آرڈر جاری ہو جائیں گے"۔

"ٹھیک ہے تم مصروف دکھائی دیتے ہو۔ بس اتنا اور بتا دو کہ گاؤں کب آ رہے ہو"؟

"گاؤں آؤں گا ضرور ــــ لیکن تمہیں بتائے بغیر تاکہ تمہاری خوشی میں حیرانی شامل رہے" حامد صاحب نے اپنے دوست سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ناصر چلے گئے تو حامد صاحب بیٹھے یادوں کے ٹھہرے پانی میں کنکریاں پھینکتے رہے۔ گاؤں کی ناگز بیلیں۔ اس میں سے گذرتی پگڈنڈیاں ــــ گاؤں کا قلعہ۔ اس کو جاتی ہوئی سیڑھیاں ــــ گاؤں کی پہاڑیاں ــــ

گم ہوتے راستے ـــ دائرے سمٹتے رہے۔

شہریار کے ڈیوٹی پر رجوع ہونے سے پہلے ہی ۶/ دسمبر ایک قیامت
ئی ملک میں یکایک تہلکہ مچا۔ عبادت گاہ سیاسی اکھاڑہ بنی۔ مذہب کے نام
کی ہولی کھیلی گئی۔ بموں کی آتش بازی چھوڑی گئی جس کی آگ میں قوم کی یکجہتی جل کر
نہ ہو گئی۔ فرقہ وارانہ اتحاد جو قوم کی حیات کا سرچشمہ ہے جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں
پیش خیمہ بنا۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو مظالم کا نشانہ بناتا رہا۔ نفرت کا
وں کے رگ و پے میں اتر کر ان کے احساسات کو مردہ کر دیا۔ بجلی جب گرتی ہے تو ہر
متاثر ہوتی ہے جو اس کی زد میں آتی ہے۔ فسادات کی چکی میں پسنے والوں
شکل ہو گیا۔ ہر شہر ہر گاؤں ہر بستی میں موت اپنا خونی پنجہ گڑو دے رہی۔ کمزور اور
سہارا عوام کی آوازیں دب کر خاموش ہو گئیں۔ رہنما طفلی تسلیوں سے عوام
بہلاتے رہے۔ کون تھا جو ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام کرتا اور فتنہ
ں آنکھیں پھوڑتا۔

حامد صاحب کے شہر میں بھی خوب واویلا مچا۔ قتل و غارتگری کا بازار
رہا۔ جب کرفیو نافذ ہوا تو سارا شہر شہر خموشاں لگا۔ پھر بھی کہیں کہیں جیل
ہونے کی خبریں پھیل جاتیں۔

حامد صاحب جس گورنمنٹ کالونی میں رہتے تھے وہ بسم اللہ کی گنبد
وہاں رہنے والے بابو لوگ تھے۔ جو دفتروں میں کام کرتے اور خود کو دنگا فساد
سے دور رکھتے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اسی کالونی میں ایک پولیس اسٹیشن
کرفیو کے زمانہ میں پولیس کی سرگرمی بڑھ جاتی اور کالونی میں رہنے والے خود

کو محفوظ پاتے۔

حامد صاحب گھر میں مقید یا تو اخبار میں چھپی دہشت آمیز خبریں پڑھا کرتے یا ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے رہتے۔ فسادات کی لپیٹ میں اپنے گاؤں کا نام پڑھ کر ان کا دل کئی بار دھڑکا تھا۔ آخر گاؤں جانے کا جنون ان کے وجود میں سرایت کر گیا۔ پھر جیسے ہی فسادات نے دم توڑا اور کرفیو برخواست ہوا وہ اپنے گاؤں کے لئے نکل پڑے۔

رات کے دس بج چکے تھے چاند کالی چادر سے منہ نکالے اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ حامد صاحب ریل گاڑی سے اترے۔ گاؤں کا اسٹیشن فسادات کے خوف کی چادر اوڑھے اب بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے وہاں انھیں کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ اپنے دوست سے ملنے کی چاہ میں وہ پیدل ہی چل پڑے۔ گاؤں کے راستے پر وہ اس وارفتگی سے بڑھ رہے تھے جیسے پیاسا پانی کی طرف۔ چلتے چلتے وہ اس راستے پہ پہنچ گئے جو اس گاؤں کے قلعے کی دامن سے گزرتا ہے۔ بچپن کی یادیں ان کے حلقے میں تلاطم بھرنے لگیں۔ یہی تو تھا وہ قلعہ جس کی سیڑھیوں پر وہ اور ناصر دن میں کئی کئی بار دوڑ لگایا کرتے اور پھر ہانپتے کلکاریاں بھرتے اس کے دامن میں بچھی ریت پر لوٹتے۔ یہ سوچتے سوچتے حامد صاحب کے قدم رک گئے۔ آگے کا راستہ ان کے لئے غیر مانوس ہو گیا تھا۔ یہاں سے گاؤں بالکل بدل گیا تھا۔ تنگ راستے وسیع سڑکیں بن گئی تھیں۔ کویلو کے گھر اونچی اونچی کئی منزلہ عمارتوں میں تبدیل ہو گئے تھے جن پر ٹی وی اینٹینا لگے ہوئے تھے۔ ٹیلیفون کے

کھمبے گاؤں کی ترقی کا نشان بنے سامنے کھڑے تھے۔ حامد صاحب کھڑے سوچتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ پیچھے سے آتی قدموں کی چاپ پر وہ چونک پڑے۔ پلٹے تو ایک نوجوان کو قریب آتا دیکھا۔ وہ نوجوان سنسان رات میں ایک اجنبی کو اپنی جانب گھورتا دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکا پھر حامد صاحب کا سوال سن کر ان کے قریب پہنچا۔

"بیٹا قاضی محلے کا راستہ بتا سکتے ہو؟"

"جی ہاں کیوں نہیں ـــــ لیکن وہاں آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ناصر صاحب سے ـــ کیا تم ان سے واقف ہو؟"

نوجوان خاموش ہو گیا پھر کچھ دیر بعد جواب دیا "جی ہاں واقف ہوں۔ ان کا لڑکا شہریار میرا دوست تھا۔"

"دوست تھا سے کیا مطلب؟ کیا اب وہ تمہارا دوست نہیں رہا؟"

نوجوان نے آہ بھری اور کہا "اب وہ اس دنیا میں کہاں رہا۔"

"کیا کہا"؟ حامد صاحب نے چونک کر پوچھا۔

"شاید آپ نہیں جانتے کہ شہریار کا قتل ہو گیا ہے" نوجوان کی آنکھیں دکھ کی سائر بن گئیں۔ حامد صاحب کو ایک ذہین چہرہ اس دکھ کے ساگر میں ڈوبتا ابھرتا نظر آیا۔ یکایک حامد صاحب نے نوجوان کا ہاتھ تھاما اور التجائی لہجے میں کہا۔

"دیکھو میں ناصر کا دوست ہوں۔ مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟"

"نوجوان نے حامد صاحب کے چہرے پر سب کچھ جان لینے کی بے تابانہ

ہیں کیا وہ اپنے باپ کا اکلوتا چہیتا بیٹا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان پھر خاموش ہوا۔ شاید اس کو شہریار کی یاد تھی۔ حامد صاحب نے نوجوان کے کاندھے پر ہمدردی کا ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بیٹا بتاؤ آگے کیا ہوا؟"

"ہم گاؤں کی پہاڑیوں میں چھپ کر میٹنگیں کیا کرتے۔ ہم نے اپنی کے اصول قائم کئے۔ ہمارا مقصد ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا ایک عرصہ تک تمام ممبر اصولوں کے پابند رہے پھر رفتہ رفتہ ہمارے ساتھی لیڈر منحرف ہونے لگے، وہ اپنی من مانی کرنے لگے کبھی کبھی وہ تعصبات زبانہ لڑائی میں فسادیوں کا ساتھ دیتے اور بموں کے شور میں انھیں ہمارے کی آواز سنائی نہ دیتی۔ ان میں وہ بھی تھے جو شہریار سے حسد رکھتے انھیں پتا چلا کہ شہریار ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لئے منتخب ہوا ہے کے حسد کی چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی اور ملک میں پھیلے فسادات میں ان غیض و غضب کے نفسانی مریضوں نے وہ کھیل کھیلا کہ بے گناہ کے خون سے گاؤں کی ندی کا گھاٹ گدلا گیا ہے"۔

نوجوان نیچی گردن کئے آنسو بہاتا رہا۔ حامد صاحب کے گلے سے ہوئی آواز نکلی۔

"کیا ناصر اس حقیقت سے واقف ہیں؟"

"نہیں جناب، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا بیٹا فسادات کی بھینٹ ہے۔ میں اس وقت ان ہی کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس گھناؤنے

کیفیت کو پڑھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔
"چلیے۔ اس قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں"
حامد صاحب نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ قلعے کے دامن میں کوئی گھر آباد نہ تھا۔ راستے دور دور تک سنسان پڑے تھے۔
نوجوان قلعے کی سیڑھیوں کی جانب مڑ گیا۔ حامد صاحب اس کے پیچھے چل پڑے۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر وہ چٹان پر نوجوان کے قریب بیٹھ گئے اور سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگے جہاں چاند کی روشنی غائب ہو رہی تھی اور بے یقینی کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔
"یہ ایک لمبی داستان ہے جناب" نوجوان نے کہنا شروع کیا "ہم سب اسی گاؤں کے کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ شہریار میرا گہرا دوست تھا۔ وہ بہت ذہین تھا۔ اس نے اسکول اور کالج میں اچھے نمبرات حاصل کیے اور اپنا مقام پیدا کیا۔ ہمارے چند ساتھی اس کی ذہانت اور ترقی سے جلتے تھے"۔ اتنا کہہ کر نوجوان خاموش ہو گیا۔
حامد صاحب نے کہا "کہو میں سن رہا ہوں"۔
"جب گاؤں میں آئے دن فسادات اور کمزور فرقے پر ظلم و زیادتیاں ہونے لگیں تو ہمارا دل پڑھنے سے اچاٹ ہو گیا۔ ہماری نظریں ان طالب علموں پر بھی تھیں جو نوکری کی امید میں ٹھوکریں کھاتے اپنے سر کے بال سفید کر رہے تھے۔ ہم نے کالج چھوڑ دیا اور نکسلائیٹ تحریک میں شریک ہو گئے۔ شہریار نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ گو وہ ہمارے خیالات کی قدر کرتا تھا۔ ہم نے بھی اسے

ہو نہیں کیا وہ اپنے باپ کا اکلوتا چہیتا بیٹا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان پھر خاموش ہوا۔ شاید اس کو شہریار کی یاد
آ رہی تھی۔ حامد صاحب نے نوجوان کے کاندھے پر ہمدردی کا ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بیٹا بتاؤ آگے کیا ہوا؟"

"ہم گاؤں کی پہاڑیوں میں چھپ کر میٹنگیں کیا کرتے۔ ہم نے اپنی
پارٹی کے اصول قائم کئے۔ ہمارا مقصد ملک کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا
تھا۔ ایک عرصے تک تمام ممبر اصولوں کے پابند رہے پھر رفتہ رفتہ ہمارے
چند ساتھی لیڈر منحرف ہونے لگے، وہ اپنی من مانی کرنے لگے کبھی کبھی وہ تعصبات
کی مجنونانہ لڑائی میں فسادیوں کا ساتھ دیتے اور بموں کے شور میں انھیں ہمارے
لیڈر کی آواز سنائی نہ دیتی۔ ان میں وہ بھی تھے جو شہریار سے حسد کرتے تھے
جب انھیں پتا چلا کہ شہریار ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے لئے منتخب ہوا ہے
تو ان کے حسد کی چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی اور ملک میں پھیلے فسادات
کی آڑ میں ان غیض و غضب کے نفسانی مریضوں نے وہ کھیل کھیلا کہ بے گناہ
شہریار کے خون سے گاؤں کی ندی کا گھاٹ گدلا گیا ہے"۔

نوجوان نیچی گردن کئے آنسو بہاتا رہا۔ حامد صاحب کے گلے سے
پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

"کیا ناصر اس حقیقت سے واقف نہیں ہے؟"

"نہیں جناب، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا بیٹا فسادات کی بھینٹ چڑھ
چڑھا ہے۔ میں اس وقت انہیں کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس گھناؤنے

قتل پر سے پردہ اٹھاؤں۔ اس کے بعد میں خود کو حکام کے حوالے کر دوں گا۔"

حامد صاحب بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ دوست کی آواز اُن کے کانوں میں گونجتی رہی۔۔۔۔۔

"اتنا اور بتا دو کہ گاؤں کب آ رہے ہو۔۔۔۔۔ اتنا اور بتا دو کہ گاؤں کب آ رہے ہو" ۔۔۔۔۔ جب برداشت نہ ہوا تو انھوں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اور اداس آنکھوں سے نوجوان کو دیکھ کر کہا۔

"بیٹا تم جاؤ میں خود میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ اس دکھ بھرے شخص سے آنکھیں ملاؤں۔ ہاں اس ستم رسیدہ شخص سے اتنا ضرور کہہ دینا کہ اس کے دوست حامد نے کہا ہے کہ ہمارے گاؤں کے اسکول اور کالج نے جہاں ہونہار سپوت پیدا کئے ہیں وہیں زہریلے ناگ بھی پروان چڑھائے ہیں۔ ان زہریلے ناگوں نے ہمارے دھرتی کے بدن کی رنگت نیلی کر دی ہے۔"

حامد صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ انھیں پتہ ابھی نہیں چلا کہ کب وہ نوجوان وہاں سے چلا گیا۔ وہ دیر تک بیٹھے سوچتے رہے۔

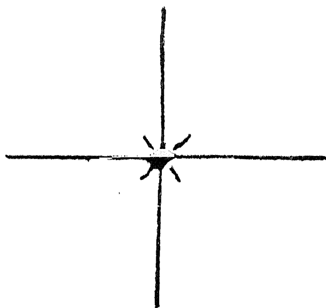
"ملک کا مستقبل کس کے ہاتھوں میں ہے؟ ان بے شعور حاسد پڑھے لکھے نوجوانوں کے" جن کے اعلیٰ احساسات خواہشات کے اندر ہو رہے ہیں ان رہنماؤں کے" جو بے چارگی کا لبادہ پہنے ملک میں کھیلی جانے والی

خون کی ہولی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں یا آل مفاد پرست سیاستدانوں کے جنہیں ملک کے فلاح و بہبود سے کہیں زیادہ اپنے ووٹوں کی ہوس دامنگیر رہتی ہے" ـــــ

بجلی کے واپس آتے ہی چھت کو لگا پنکھا زور سے گھومنے لگا۔ مور کا پر اور اخبار میز پر سے نیچے گر پڑے۔ حامد صاحب نے جھک کر اخبار اٹھایا اور پھر سے اس خبر کو پڑھنے لگے۔

# اور پھر بنگلہ بِک گیا

میں اپنے پیار کی شدت کے باوجود اب بھی
یہ کیسا بارِ امانت اُٹھائے پھرتا ہوں



خالہ امی نماز کی چوکی سے اترنے لگیں تو اپنا توازن کھو بیٹھیں اور قریب دھری الماری سے جا ٹکرائیں - نعیمہ انھیں اٹھانے کے لئے دوڑیں - خادمہ بھاگتی ہوئی آئی - دونوں نے مل کر انھیں سہارا دیا اور پلنگ پر لٹا دیا - خالہ امی بائیں گال پر ہاتھ دھرے کراہنے لگیں نعیمہ نے آہستہ سے ان کا ہاتھ ہٹایا - دیکھا گال پر خون منجمد ہو کر نیلا دھبہ چھوڑ گیا ہے -

ضعیفی میں انسان معمولی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا خالہ امی کی بے چینی اور اعصابی تناؤ کو قابو میں لانے کے لئے ڈاکٹر نے انھیں گرم دودھ پلایا اور خواب آور قرص کھلائی ـــــ نسخہ لکھا اور چلا گیا ـــــ جلد ہی دوا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا - خالہ امی سو گئیں تو خادمہ نسخہ پکڑے دوا لانے چلی گئی - نعیمہ نے اپنی کرسی خالہ امی کے پلنگ کے قریب کھینچ لی - اور خالہ امی کو دیکھنے لگیں - ان کی گذری زندگی کے تمام گوشوں کی مکمل تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئی ـــــ

خالہ امی اور خالو ابا نے زندگی کی مسرتوں کو چھک کر پیا تھا - ایک مطمئن مسرور شادماں شادی شدہ جوڑے کی مثال قائم کی تھی - ان کی محبتوں

کے پھول امتیاز اور اکرام تھے جنھیں انھوں نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ جب وہ دونوں جوان ہوئے اور اپنی تعلیم مکمل کر چکے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔

خالو ابّا اونچے عہدے پر فائز تھے۔ بڑے ٹھاٹھ کی زندگی گزارتے تھے انھوں نے بڑے ارمانوں سے اپنے بیٹوں کے لئے ایک شاندار بنگلہ بنایا۔ نعیمہ کو یاد تھا کہ تعمیر سے پہلے اس بنگلے کا نقشہ کئی بار بنایا اور بدلا گیا۔ شاید اس وقت تقدیر خالو ابا کے اس ولولے پر مسکرا رہی ہوگی کیونکہ بعد میں قسمت نے ایسا نقشہ بدلا کہ دونوں لڑکے ہزاروں میل دور ایسے بس گئے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے چلے جانے سے خالو ابّا کا بنگلہ سائیں سائیں کرنے لگا۔ انھوں نے اس کا ایک حصّہ کرائے پر اُٹھا دیا۔

پھر یوں ہوتا کہ دن رات کی محنت اور جفاکشی کے بعد پُرسکون لمحات کی تلاش میں کبھی امتیاز کبھی اکرام اپنے وطن چلے آتے لیکن ان کی مصروفیت پسند طبیعت اس سکون و راحت کی زندگی سے جلد اکتا جاتی اور وہ پھر اسی برق رفتار زندگی کے گھوڑے پر سوار ہوتے واپس چلے جاتے۔

جب خالو ابا کو پنشن ہو گئی تو دونوں بیٹوں نے اصرار کیا "امریکہ چلے آئیے۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجئے" اِدھر خالہ امی خالو ابا بھی بے چین کہ بیٹوں سے جا ملیں۔ بہوؤں کو گلے لگائیں، پوتا پوتی کو دیکھیں۔ ان خواہشوں نے ان کے شوق کے قدم تیز کر دیئے اور ایک دن وہ ہوا کے دوش پر سوار امریکہ پہنچ گئے۔

بہت اچھا لگا خالہ امی خالو ابا کو اپنے بچوں میں گھر سے رہنا پردیس میں بسے رشتے داروں کے ہاں دعوتیں کھانا ۔ بچوں نے ان کے آنے کی خوشی میں چھٹی لے رکھی تھی ۔ چھٹیاں ختم ہوئیں ۔ بچے بڑے ہر روز صبح گھر سے نکل جاتے اور شام دیر گئے تھکے ہارے واپس آتے ۔ رشتے دار بھی اپنی اپنی مصروفیتوں میں مشغول رہتے ۔ خالہ امی اور خالو ابا کے درمیان ایک پراسرار خاموشی صبح سے شام تک چھائی رہتی جس کو کبھی خالہ امّی اور کبھی خالو ابا کوئی بات کرکے توڑتے ــــــ پھر وہی سناٹا ــــــ پھر وہی خاموشی ــــــ وقت ہے کہ اپنی جگہ تھما رہتا ــــــ اخبار پڑھو ــــــ رسالے چاٹ جاؤ ــــــ نہ وقت ہی کٹتا اور نہ ہی وہ پراسرار خاموشی دور ہوتی ۔ زندگی جس ڈھرے پہ آکر رک گئی تھی وہ اس کے عادی نہیں تھے ۔ ان کی طبیعت وہاں کی یک رنگی زندگی سے اکتا گئی کھانا بدمزہ لگنے لگا ــــــ وہی ابلے انڈے وہی ابلی ترکاری ــــــ ادھ پکا گوشت ــــــ دودھ کی بوتلیں ــــــ انھیں اکتائی آنے لگی ــــــ دونوں ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھتے ۔ کچھ عرصے تک انھوں نے اس زندگی کو جھیلا ۔ پھر سوچنے لگے کیا کیا جائے ؟ یہ زندگی تو اپنے بس کی نہیں ــــــ کیا واپس چلے جائیں ــــــ اپنے ملک میں لطفِ خرام تو ہے ۔ پھر سوچتے بچے کیا کہیں گے کیا برا مان جائیں گے ؟ ــــــ لیکن ان کا ڈر یا ان کا بلبلہ نکلا ــــــ بچوں نے کہا ــــــ "ہر شخص کو حق ہے اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کا"

خالہ امی اور خالو ابا نے اطمینان کی سانس لی ۔ ان کا ذہنی تناؤ

لیکن خالو ابا کو ہر طرف امید کے دیئے بجھے بجھے نظر آئے۔ انھوں نے
جواب دیا "بیٹا عمارت گر رہی ہے اب اسے گرنے سے کوئی نہیں روک
سکتا۔ مجھے اس بنگلے میں سو جانے دو اور اس مٹی میں مل جانے دو جس میں میرے
آباؤ اجداد دفن ہیں"۔
بچے خاموش ہو گئے لیکن خالو ابا کی مایوسی نے خالہ امی کے صبر کی
حالت الٹ دی، ان کی متاعِ [illegible]ن چھین لی ــــ خالہ امی نے خالو ابا کی خاطر
اپنے آپ کو سنبھالا ــــ اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کیا اور حوادث سے ٹکرانے
کے لئے تیار ہو گئیں۔
دن رات کی نگہداشت نے خالو ابا کے عرصۂ حیات میں اضافہ کیا
لیکن اس موذی مرض نے چھ فٹ سے اونچے جاندار شخصیت کے مالک خالو ابا کو
ایسا گھلایا کہ جسم کھوکھلا ڈھانچہ بنکر رہ گیا۔ جب حلق پوری طرح مرض کے
قابو میں آگیا تو بات کرنی مشکل ہو گئی۔ ہر بات کاغذ پر لکھ کر بتانے لگے۔
ایسی حالت میں بھی اخلاقِ حمیدہ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جس سے متاثر
ہو کر ان کی نگہداشت کو رکھی گئی نرس کی زبان ان کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھی۔
وہ پوری لگن سے ان کی خدمت کرتی، سو سو جتن سے انھیں غذا پہنچانے کی
کوشش کرتی۔ خالو ابا نفی میں سر ہلاتے رہتے۔ یہ دیکھ کر خالہ امی کی آنکھیں
بھیگ جاتیں۔ نرس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی لیکن خالہ امی کی آنکھوں میں پھیلی
وحشت اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی۔ وہ ان کے قریب بیٹھ جاتی انھیں
ہمت دلاتی اور سفید مقدس لباس کا فرض نبھاتی۔

دور ہوا۔ واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایرپورٹ پر دونوں کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے سب کو گلے لگایا خوب پیار کیا۔

جیسے ہی وہ اپنے شہر کی سرزمین پر پہنچے عجیب سی خوشی کا احساس ہونے لگا جوں ہی اپنے بنگلے میں قدم رکھا اپنائیت نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ اطاعت گزار نوکروں نے استقبال کیا۔ بے فکر رشتے داروں نے گھیر لیا۔ زندگی نے پھر اطمینان کی چادر تان لی۔

کبھی وہ سوچتے کتنا آرام سے رکھا تھا بچوں نے ــــــ کتنے خوش تھے وہ ــــــ پھر انھیں کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیوں لوٹ آئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے "ہمارے قدم سست ہو گئے ہیں اور وہاں کی رفتار تیز ہے ۔ ہم آہنگی کیسے پیدا ہوتی"۔

واپس آئے کچھ عرصہ بیتا تھا کہ خالو ابا کی پُر سکون زندگی کے ساگر میں ارتعاش کی لہریں اٹھیں۔ سگریٹ پینے کی پرانی عادت نے رنگ دکھایا۔ حلق کی جلن اور سوزش میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب مرض کی تشخیص ہوئی تو خالو ابا کو کینسر کے دواخانے میں شریک کیا گیا ــــــ جس یقین اور ارادے کا ہاتھ تھام کر وہ اپنے شہر واپس آئے تھے۔ وہ یاس اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گم ہو گیا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ جب مرض میں کچھ افاقہ ہوا تو خالو ابا کو گھر لایا گیا۔ خدمت کے لئے ایک نرس رکھی گئی۔ پھر بچوں نے خلوص و محبت سے لکھا۔ "بابا ــــــ امریکہ چلے آئیے ۔ یہاں بہتر علاج ہو گا۔ اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے"۔

پھر چہل چلاؤ کا ہنگام خالو ابا کے سر پر آ گیا۔ ان کی طبیعت بگڑ تی گئی۔ ڈاکٹروں نے اپنی کوشش کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ ہر صبح و شام، امتیاز اور اکرام کو خالو ابا کی کیفیت ملتی رہی۔ ڈاکٹروں کے مشورہ پر وہ فوری چلے آئے۔ کالی سیاہ راتیں سب کی آنکھوں میں کٹنے لگیں — جب حکم قضا نے خالو ابا کی مصیبت کا زمانہ ختم کر دیا تو اس جدائی پر ہر دل تڑپ اٹھا ہر آنکھ اشکبار تھی۔ خالہ امی کے دکھ کی انتہا نہ رہی۔ پچاس برس کا ساتھ چھوٹا تھا۔ انھوں نے سارے زیور اتار پھینکے اور بے رنگ ساڑی پہن کر ایسی اجڑی اجڑی لگیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ آہستہ آہستہ سب نے اس صدمے پر صبر و ضبط سے قابو پا لیا۔

خالہ امی کی محبت نعیمہ کو وقت سے بے نیاز ان کی خدمت میں پہنچا دیتی۔ ایک شام نعیمہ جب خالہ امی سے ملنے گئیں تو بند کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئیں۔ اندر سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ امتیاز کی غصہ بھری آواز — خالہ امی کی دبی دبی آواز — نرس کی روہانسی آواز — نعیمہ کچھ سمجھ نہ پائیں۔ انھوں نے ایک منٹ کے لئے سوچا۔ پھر رکے بغیر گھر واپس چلی آئیں — کچھ ہی دنوں بعد امتیاز اور اکرام امریکہ واپس چلے گئے۔ کیونکہ خالو ابا کے چہلم پر انھیں پھر یہاں آنا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد بنگلہ پھر سے ویران ہو گیا۔ ملاقاتیوں کی آمد کم ہوتی گئی — ایک نعیمہ تھی جو وقت بے وقت خالہ امی کے اکیلے پن کو دور کرنے پہنچ جاتیں۔ خالہ امی ہر وقت خالو ابا کی باتیں کیا کرتیں۔

"تمہارے خالو ابّا کہا کرتے تھے دیکھو میں نے بنگلہ تمہارے نام کر دیا ہے۔ اسے کبھی نہ بیچنا"

"تمہارے خالو ابا کہا کرتے تھے۔ نعیمہ بہت پیاری لڑکی ہے تمہیں بہت چاہتی ہے تمہارا خیال بیٹی کی طرح رکھے گی"۔

"تمہارے خالو ابا کہا کرتے تھے تم نے بچوں کو میری خاطر چھوڑ دیا۔ اب میرے بعد ان کے پاس چلی جانا"

اور خالو ابا کا ذکر ہوتا رہتا ان کی آنکھیں آبی لکیر بناتی رہتیں

خالو ابا کا چہلم ان کے شایان شان ہوا۔ اس بار امتیاز اور اکرام کم عرصے کے لئے آئے تھے لیکن ان کے قیام کا عرصہ بڑھتا ہی گیا۔ نعیمہ نے ایک بار پھر انھیں خالہ امی سے بند کمرے میں گفتگو کرتے پایا۔ یکایک امتیاز اور اکرام کے واپس جانے کی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔ خالہ امی کی اداسی کا رنگ گہرا ہو گیا۔ ایک دن انھوں نے نعیمہ کو بلا بھیجا اور کہا۔

"نعیمہ تم اپنا چھوٹا گھر مجھے کرایہ پر دے دو"

"خالہ امی آپ اس چھوٹے گھر میں رہیں گی" نعیمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹی بات یہ ہے کہ ہم بنگلہ بیچ رہے ہیں" خالہ امی نے نعیمہ کی پیشانی پر پڑی حیرانی کی گرہ کو کھولا۔

"اور وہ جو خالو ابّا آپ سے کہا کرتے تھے بنگلہ نہ بیچنے کے لئے؟" نعیمہ نے پوچھا۔

خالہ امی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "اب حالات بدل گئے ہیں

امتیاز اور اکرام وہاں کے شہری بن گئے ہیں۔ تمہارے خالو ابا نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ پھر میری زندگی کا کیا بھروسہ۔؟"

"اور بچے ـــــ وہ راضی ہیں آپ کو اکیلا چھوڑنے کے لئے؟"

"نہیں بیٹی وہ تو اصرار کر رہے ہیں ساتھ چلنے کے لئے لیکن مجھے اب پنشن کی کارروائی آگے بڑھانا ہے۔ اور پھر میرا دل نہیں مانتا وہاں اکیلے رہنے کے لئے۔ میں بھی تمہارے خالو ابا کی طرح وطن کی مٹی میں مل جانے کی خواہشمند ہوں۔"

ـــــ اور پھر بنگلہ بک گیا۔

خالہ امی اپنی قدیم خادمہ کے ساتھ نعیمہ کے ملحقہ چھوٹے گھر میں چلی آئیں ـــــ نعیمہ نے ان دونوں گھر کی درمیانی دیوار کو توڑ کر فاصلے کو کم کیا۔

خالہ امی نے اُس بنگلہ کے گوشہ گوشہ سے وابستہ یادوں کی کرچیوں کی چبھن کا احساس کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ نعیمہ حیران رہتی کہ زمانہ کی اونچ نیچ میں اپنی سطح کو ہموار رکھنے کا ہنر خالہ امی نے کہاں سے سیکھا۔

ایک دن بند کمرے کا راز فاش کرنے کے لئے خالہ امی نے اپنے بند لب کھولے۔

"تمہیں بتاؤں نعیمہ ـــــ تمہارے خالو ابا کی نگہداشت کے لئے جو نرس رکھی گئی تھی وہ بڑی خوبیوں کی مالک تھی۔ تمہارے خالو ابا تھے بڑے قدر شناس۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے کاغذ پر لکھا کہ وہ نرس کو ایک تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بات نرس کو بتلائی اس نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا

ہنے لگی مجھے اپنی خدمت کا اچھا معاوضہ مل رہا ہے پھر تحفہ کیوں؟"

"پھر کیا ہوا خالہ امی"

"تمہارے خالو ابا نے لکھا اس خلوص و محبت کے لئے جو اس نے ہمیں دی ہے
یں مسکرا کر خاموش ہو گئی پھر تمہارے خالو ابا نے انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی اتاری
ور نرس کے حوالے کر دی"۔

نعیمہ نے حیرت سے سانس کھینچی اور کہا "خالو ابا نے وہ قیمتی ہیرے
ی انگوٹھی نرس کو دے دی"۔

"ہاں بیٹی۔ لیکن وہ نرس لالچی نہیں تھی اس نے انگوٹھی کو غور سے دیکھا
ور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ اتنی قیمتی تحفہ کی مستحق نہیں ہے۔ تمہارے خالو ابا نے
صرار کیا تب اس نے انگوٹھی رکھ لی"۔

"تعجب ہے آپ نے خالو ابا سے کچھ نہیں کہا"

"میں حیران ضرور ہوئی تھی بیٹی لیکن میں نے دیکھا کہ سخاوت کا جوش
ون بنکر تمہارے خالو ابا کے انگ انگ میں کھیل گیا ہے۔ اسی لئے میں نے
نع کیا تھا امتیاز کو کہ نرس سے وہ انگوٹھی واپس نہ مانگے"۔

نعیمہ کو بند کمرے سے نکلتی نرس کی روہانسی آواز یاد آ گئی "یا اللہ!
ج کیسی کیسی باتوں پر سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ پھر کیا ہوا خالہ امی؟ نرس نے وہ
نگوٹھی واپس کر دی؟"

"نہیں بیٹی۔ امتیاز نے تو ہیرے کی قیمت سے بھی زیادہ پیسہ دینا
اہا۔ نرس نے جواب دیا وہ انگوٹھی ایک بزرگ کا تحفہ ہے، کسی مہاجن کا

~~روپیہ، پیا یومہ کے ساتھ واپس لیا جائے"۔~~

"امتیاز کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا خالہ امی"

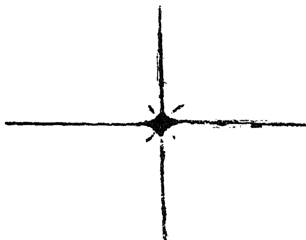
"امتیاز نے بتایا تھا کہ وہ انگوٹھی کو خاندان کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نرس کے انکار پر اس دن غصہ اور ناکامی کی سرخی اس کے چہرے پر دیکھ کر میں تو ڈر گئی تھی نعیمہ"

نعیمہ جانتی تھی کہ بات بات پر غصہ سے بھر جانا امتیاز کی عادت ہے لیکن خالہ امی کا اس بات سے ڈر جانا نعیمہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید خالو ابا کے بعد ان کے اکیلے پن نے انھیں ڈرا دیا تھا

اس کے بعد بھی بند کمرے میں ہونے والی میٹنگیں نعیمہ کو یاد آگئیں لیکن خالہ امی نے اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ نعیمہ نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ شناسا سرخی خالہ امی نے پھر ایکبار امتیاز کے چہرے پر دیکھی ہوگی تبھی تو وہ بنگلہ بیچنے پر راضی ہوگئیں۔ سچ ہے مائیں کتنی عظیم ہوتی ہیں۔ وہ کس طرح اپنے بچوں کی کمزوریوں کو راز کی طرح اپنے سینے میں چھپا لیتی ہیں۔ نعیمہ کو اپنی خالہ امی پر پیار آنے لگا۔ انھوں نے اپنا چہرہ خالہ امی کے چہرے کے قریب کر لیا۔ دیکھا نیند کی دوا کے زیر اثر وہ غفلت کی نیند سو رہی ہیں سرخ و سفید جھریوں والے خوبصورت چہرے پر نیلا دھبہ زیادہ گہرا اور نمایاں ہوگیا ہے۔

# بازگشت

تمہارے دل کی ہر اک کشمکش سمجھتا ہوں
مگر مجھے تو نہ دو اپنی کشمکش کی سزا



شہر کے گنجان علاقے میں خواجہ صاحب کا باڑا مشہور تھا۔ اس باڑے میں رہنے والے کرائے دار مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے پھر بھی وہ ایک دوسرے کے گرم سرد حالات کے ساتھی تھے کیونکہ ان کے ذہنوں کی زمین پر فرقہ واریت کی تخم پاشی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں خواجہ صاحب کی لڑکیوں کی ریٹا آنٹی بھی تھی لکشمی موسی بھی اور سلطانہ چاچی بھی۔ کوئی ٹیچر تھی کوئی کلرک اور کوئی کچھ اور۔

خواجہ صاحب کی تین لڑکیاں تھیں۔ آمنہ سب سے بڑی تھی پھر ثمینہ۔ یہ دونوں اپنی ماں کی طرح سیدھی سادی اور نرم مزاج کی مالک تھیں لیکن سب سے چھوٹی راضیہ اپنے باپ پر گئی تھی۔ تیز اور گرم مزاج۔ عمر میں سب سے چھوٹی تھی لیکن زمانے کی نبض خوب جانتی تھی۔

جب خواجہ صاحب کو یکے بعد دیگرے بیماریوں نے آ گھیرا تو ان کا جمع کیا ہوا سارا پیسہ خرچ ہو گیا۔ مجبوراً باڑا رہن رکھا گیا۔ باڑے والوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ رہن کا پیسہ ادا ہو جائے لیکن ان کی یہ کوشش شرمندۂ تعبیر نہ ہوئی۔ سود کی تہیں جمتی گئیں جس کے وزن نے خواجہ صاحب کے وجود کو اپاہج کر دیا۔ باڑے کے نئے مالک نے پرانی دوستی کا لحاظ

ـ کھتے ہوئے خواجہ صاحب اور ان کے گھرانے والوں کو بارے میں لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت
دے دی لڑکیوں نے اپنی تعلیم منقطع کر کے گھر پر سلائی کا کام شروع کر دیا۔
فرصت کے اوقات میں آمنہ نے اپنے پڑھنے کا شوق ریٹائرڈ آنٹی کی لائبریری نما
الماری میں دھری کتابیں پڑھ کر پورا کیا۔ ان کتابوں نے آمنہ کو اصلی زندگی سمجھنے
اور غور و خوص کرنے پر مائل کیا۔

جب شادیوں کے سلسلے میں اکثر گھروں میں ناکامی، دل شکستگی اور مایوسی
کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تو آمنہ کیلئے روشن منزل سے آیا اسلم میاں کا رشتہ قسمت
سے چھینکا ٹوٹا کا مصداق بن گیا۔ آمنہ کی ماں نے اسے قبول کر لیا کیوں کہ اسلم میاں
کی ماں ثریا بیگم اس کی دودھ شریک بہن تھیں۔ جنہیں اس کی لڑکیاں آنٹی ممانی
کہہ کر پکارتی تھیں۔ لیکن خواجہ صاحب اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ یہ
رشتہ انھیں احساس شکستگی دلا رہا تھا۔ پھر اس رشتے کو لے کر بارے میں
خوب بحثیں ہوئیں۔ ان بحثوں سے تنگ آکر راضیہ نے آمنہ کے دل کا
حال جاننا چاہا اور اس سے پوچھا۔

”آمنہ آپا آپ بتائیے ۔۔ کیا آپ روشن منزل والے اسلم میاں سے
شادی کرنے راضی ہیں؟“

آمنہ نے کہا ”ہاں میں راضی ہوں“

”یہ جان لینے کے بعد بھی کہ اسلم میاں پر آئے دن دورے پڑتے
رہتے ہیں؟“

”ہاں اس لئے کہ ان کا علاج جاری ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے

شادی کے بعد ان کے دوروں کی شکایت جاتی رہے گی۔ راضیہ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ ۔۔۔ کب تک ہمارے ماں باپ اپنے کمزور کاندھوں پر تین تین لڑکیوں کا بوجھ اٹھائے مایوسی کی زندگی گزارتے رہیں گے ۔۔۔ اور پھر وعدے کے مطابق شادی پر جو پیسہ ملے گا وہ ثمینہ کیلئے ایک اچھا لڑکا لانے میں مددگار ثابت ہوگا"

راضیہ نے جھنجھلا کر کہا "میں اگر ثمینہ آپا کی جگہ ہوتی تو آپ کی قربانی میں لتھڑی ایسی شادی کو کبھی قبول نہ کرتی ۔۔۔ اچھا بتائیے آپ کے جذبات ۔۔۔ کیا وہ کوئی معنی نہیں رکھتے؟"

"جذبات! منی جذبات جب کسی اعلیٰ مقصد کی گود میں کروٹ لیتے ہیں تو زندگی کو سکون و اطمینان کے گہوارے میں جھلاتے ہیں ۔۔۔ میں نے ریٹا آنٹی کو دیکھا ہے جنھوں نے اپنی ممتا کے جذبات کا گلا گھونٹ کر اپنے لڑکے کو کوسوں دور بھیج دیا ہے تاکہ اس کا مستقبل سنور جائے۔ میں نے لکشمی موسی کو دیکھا ہے جنھوں نے اپنے سارے جذبات دل کی کال کوٹھری میں بند کر لئے ہیں اور شوہر کا دنش چلانے وہ سوت کو گھر لے آئی ہے" وہ پیار سے اسے منی کہا کرتی تھی۔

"لیکن وہ لوگ خود آپ کی اس شادی کے حق میں نہیں ہیں" راضیہ نے یاد دلایا۔

"کیا کہنے ان کے خلوص کے منی ۔۔۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں بھی اس عمر میں احساسات کی صلیب پر چڑھ جاؤں"

"اور آپ کی امی! کیا وہ آپ کو نہیں چاہتیں؟ کیا وہ ممتا کے جذبات نہیں رکھتیں؟"

"ممتا کے جذبات تو ناقابل شکست ہوتے ہیں منی۔ تم کیا سمجھتی

ہو کہ ہماری ماں کے جذبات افلاس کی کیچڑ میں دھنس گئے ہیں؟ نہیں ——— ماں نے اس شادی میں میرا آرام اور سکون دیکھا ہے ——— ماں نے اس شادی میں ثمینہ کا مستقبل دیکھا ہے ——— ماں نے اس شادی سے آنٹی مما کے احسانات کا بوجھ اترتا دیکھا ہے اور ماں نے اس شادی سے حقِ قرابت ادا ہوتا دیکھا ہے۔ آخر آنٹی مما ہماری ماں کی بہن ہے"

"کیا آنٹی مما کی اور بہنیں نہیں ؟ ——— کیا ان کی لڑکیاں اسلم میاں کے قابل نہیں؟ وہ بھلا اپنی لڑکیوں کا بیاہ بیمار اسلم میاں سے کیوں رچائیں گی۔ ایسا وقت پڑنے پر امیر بہنوں کو غریب بہنوں کی لڑکیوں کی یاد آجاتی ہے"

آمنہ نے اُسے گلے لگا لیا اور کہا "امیر غریب سب ایک ہی خالق کے بنائے سنوارے ہوئے ہیں۔ مُنّی تم اپنی ساری کڑواہٹ پی جاؤ اور خوش خلقی کی صفت کو اپنا لو پھر دیکھو تمہارے لئے چاروں طرف مسرت پھیلانا کتنا آسان ہو جاتا ہے"۔

روشن منزل سے آمنہ کی ماں کی طلبی ہوئی تو ساتھ میں آمنہ کو بھی لانے کے لئے کہا گیا۔ ثریا بیگم نے بچپن میں آمنہ کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے لڑکیوں کو روشن منزل جانے سے روک دیا تھا۔

روشن منزل کے آراستہ دالان میں تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لئے ثریا بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے آمنہ کو آتے ہوئے دیکھا تو تکیہ کا سہارا چھوڑ دیا اور غور سے آمنہ کو دیکھتی رہیں پھر قریب بلا کر بیٹھا لیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں آخر میں پوچھا۔

"آمنہ کیا تم اسلم میاں سے شادی کے لئے رضامند ہو؟ سوچ سمجھ کر جواب دو۔ آگے چلکر ہمارے لئے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دو۔"

آمنہ نے سر گھما کر اپنی ماں کو دیکھا جو قریب کی کرسی میں دھنسی بے رونق آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ جس کا گورا رنگ زمانے کی تیز دھوپ سے سونلا گیا تھا۔ جس کے چمک دار گھنے بال وقت کی گرد سے بدرنگ ہو گئے تھے۔ آمنہ نے اپنی دُکھتی آنکھیں ثریا بیگم کی جانب پھیریں اور پوچھا۔

"مصیبت آپ پر کیوں آئے گی آنٹی مما؟"

ثریا بیگم نے محسوس کیا کہ آمنہ نے یہ سوال پوچھ کر انھیں عیش وعشرت کے آئینے میں صورت دکھائی ہے۔ وہ خجل ہو گئیں اور شادی کے شرائط سُنانے لگیں۔

"شادی کے بعد تم ہر وقت اسلم میاں کے ساتھ رہو گی اور کچھ عرصہ کیلئے اپنے ماں باپ اور بہنوں کو بھول جاؤ گی۔ تمہارے گھر سے کوئی فرد تم سے ملنے نہیں آئے گا جب تک کہ میں نہ بلاؤں۔ میں نے جو روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے وہ تمہاری ماں کو مل جائے گا۔"

آمنہ سر جھکائے شرائط سنتی رہی۔ آخر میں آہستہ سے کہا "مجھے منظور ہے۔"

آمنہ کی شادی کا دن آ گیا۔ باڑے والوں نے ملکر آمنہ کے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائی۔ اُسے خوشبوؤں میں بسایا۔ اور شادی کا جوڑا پہنا کر رخصت کر دیا۔ نکاح کی تقریب روشن منزل میں منعقد کی گئی تھی۔ اس میں

صرف آمنہ کی ماں اور بہنوں کو شریک ہونا تھا۔ رخصتی کے وقت آمنہ اپنے ابا، بچے باپ اور باڑے والوں کے گلے لگ کر خوب روئی۔

روشن منزل کے پچھواڑے ایک چھوٹا جھونپڑی نما گھر تھا۔ جہاں نکاح کا انتظام کیا گیا تھا۔ گھر نہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا اور نہ پھولوں کی لڑیوں سے مہک رہا تھا۔ براتیوں میں اسلم میاں کے چند قریبی رشتے دار مدعو تھے۔

اسلم میاں شادی کی خاندانی روایتی شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے دالان میں بچھی مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خاندانی وجاہت اور سرخ و سفید رنگ نے انھیں طنطنہ بخشا تھا۔ دالان سے لگے کمرے میں آمنہ اور اس کی بہنوں کو بٹھایا گیا تھا۔ انھوں نے دروازے پر پڑی چلمن کی اوٹ سے وجیہہ اسلم میاں کو دیکھا تو کچھ دیر کے لئے اپنا دکھ درد بھول گئیں۔ ان کے چہرے مسرت سے گلنار ہو گئے۔ نکاح کے اختتام پر آمنہ کی ماں اور بہنیں امید و بیم کے جذبات لئے لوٹ گئیں۔

اب دوسری لڑکی ثمینہ کے لئے بر کی تلاش شروع ہو گئی۔ لڑکا ڈھونڈتے ڈھونڈتے چھ ماہ نکل گئے۔ ثمینہ کا دولھا قریب کے ضلع کا رہنے والا نکلا۔ اس شادی پر باڑے میں خوب شادیانے بجے۔ گیت گائے گئے۔ رسمیں ادا ہوئیں اور اسطرح یہ شادی اختتام کو پہنچی۔ لیکن آمنہ کی شادی کی یاد ہر وقت کانٹا بنکر سب کے دلوں میں کھٹکتی رہی۔

ثمینہ کی شادی کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ روشن منزل سے آمنہ کی ماں کیلئے بلاوا آیا۔ وہ دوڑتے دوڑتے وہاں پہنچیں۔ راضیہ سوچ میں

پڑ گئی اور شک و شبہ کے جھولے میں جھولنے لگی۔ ماں کو گئے بہت دیر ہوگئی تو راضیہ بے چین ہوگئی۔ باڑے والوں نے اُسے دلاسا دیا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ماں اپنے دل پہ کوئی بوجھ اُٹھائے واپس آگئی۔ سب نے سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ ماں نے اسلم میاں کے ذکر کا سہارا لیا۔ اور کہا "اب اسلم میاں کے دوروں کی شکایت میں کمی ہوگئی ہے۔ وہ صحت مند دکھائی دے رہے ہیں"۔

"اور آمنہ آپا؟ وہ کیسی ہیں؟" راضیہ نے بے چینی سے پوچھا۔

اپنے مجروح احساسات کو چھپاتے ہوئے ماں نے بتلایا۔ "آمنہ بہت کمزور ہوگئی ہے"۔

"کیوں؟ کیا ہوا آمنہ کو؟" سب نے بہ یک وقت پوچھا۔

ان مشفقانہ آوازوں نے ماں کے صبر کے بند کو توڑ دیا۔ دل میں چھپا درد آنکھوں کی راہ سے بہنے لگا۔ "کیا بتاؤں آمنہ ماں بننے والی تھی لیکن ثریا بیگم نے اُسے ماں بننے نہیں دیا۔ کہتی ہے کہ شادی کی شرائط میں یہ نہیں تھا۔ اولاد کا غم بہت بُرا ہوتا ہے نا۔ آمنہ اس غم کی تاب نہ لاکر نڈھال اور کمزور ہوگئی ہے"۔

یہ سُنکر راضیہ نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور دانت پیستے ہوئے کہا "قسم ہے اگر میرا بس چلتا تو شادی سے پہلے میں اس آنٹی مما سے شرائط لکھواتی"۔

باڑے میں کچھ دنوں تک غم و غصہ کی لہر دوڑتی رہی۔ خواجہ صاحب کبھی اپنی بیوی کو اور کبھی ثریا بیگم کو جلی کٹی سناتے۔ ابھی ان لوگوں کا غصہ کم نہیں ہوا تھا کہ ان پر ایک اور آسمان ٹوٹ پڑا۔ خبر ملی کہ آمنہ نے اس

جہانِ فانی کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ پھر کیا تھا باڑے میں کہرام مچ گیا۔ لوگ روتے روتے روشن منزل پہنچ گئے۔

اسی دالان میں ثریا بیگم اسلم میاں اور دو تین نوکر مغموم بیٹھے ہوئے تھے۔ دالان کے اُس پار آمنہ کو لٹایا گیا تھا۔ ثریا بیگم نے انھیں دیکھا تو روتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کیا خبر تھی آمنہ اتنی جلدی ہم سے منہ موڑ لے گی۔ آج صبح ایک عرصہ بعد اسلم میاں پر دورہ پڑا تھا۔ اُس وقت ان کے قریب صرف آمنہ تھی۔ اس لئے وہ مدد کے لئے آگے بڑھی اور اسلم میاں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن خود چکرا کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ اسلم میاں بھی زمین پر آ رہے۔ اس طرح کہ ان کا سارا بوجھ آمنہ کے چہرے پر تھا۔ کمزور آمنہ کا دم گھٹ گیا۔ وہ اسلم میاں کو ہٹا نہ پائی جب اسلم میاں کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو مدد کے لئے پکارا تب تک آمنہ دم توڑ چکی تھی۔"

ثریا بیگم کے ساتھ سب دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ جب جی بھر کر رو لئے تو باڑے والی سلطانہ چاچی نے کہا۔

"ہم آمنہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

اس آواز کے ساتھ سب کھڑے ہوئے۔ ان کے بگڑے تیور دیکھ کر ثریا بیگم خاموش ہو گئیں۔ اور پھوٹ کر رونے والی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس کو تسلی دی۔

"صبر کرو راضیہ۔"

لیکن ان کی تسلّی نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ راضیہ بھڑک اٹھی اور ان سے جواب طلب کرنے لگی۔ "بتائیے ۔۔ بتائیے آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں آمنہ آپا کی شادی ڈھنگ سے ہونے نہیں دی؟ کیوں انھیں سب سے الگ تھلگ روشن منزل کے پچھواڑے میں رکھا؟ کیوں انھیں ماں بننے نہیں دیا۔ خدا آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

ثریا بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گلے کی رگیں پھول گئیں ۔۔ انھوں نے ضبط سے کام لیا اور وہاں سے ہٹ گئیں۔ لیکن راضیہ کی فریاد نے اسلم میاں کے چہرے کا رنگ متغیر کر دیا۔ اس فریاد سے متاثر ہونا ان کے لئے طبعی اور فطری تھا۔ راضیہ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو آگے بڑھ کر ان کی تسلّی کے لئے اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔ وہ سنبھل گئے۔

خواجہ صاحب آمنہ کے غم میں گھلتے رہے۔ آمنہ کی ماں صبح و شام اپنے رگ و پے میں اترتا فرقت کا زہر پیتی رہی۔ ایک راضیہ تھی جو اپنے کڑوے دل بھول کر ماں باپ کا دکھ بٹورتی رہی۔ اس کی سمجھ میں آمنہ کی زندگی کا مقصد اور مدعا آ گیا تھا۔ ناگوار باتیں کڑوا دل کر کے پی جانا وہ سیکھ رہی تھی۔ آنے والا وقت کس کے حصّے میں کیا لائے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ وقت کو نہ کہیں ٹھہراؤ ہے نہ قرار۔ وہ اڑتا آگے کی طرف بڑھتا ہی رہتا ہے۔ جب کبھی یہ مہربان ہو جاتا ہے تو اس کے لئے راحت و کامیابی کی راہیں کھول دیتا ہے۔ وقت اسلم میاں پر مہربان ہوا تو ان کو جامِ صحت پلایا۔ اور انھیں تندرست کر دیا۔

سارے رشتے داروں کی نظریں اسلم میاں کی وجاہت اور دولت پر جم گئیں۔ اسلم میاں کے لئے رشتوں کے انبار لگنے لگے۔ ثریا بیگم باغ باغ ہوگئیں لیکن ان کی خوشیوں پر اوس اُس وقت پڑی جب اسلم میاں نے سارے رشتے یہ کہہ کر ٹھکرا دیئے کہ راضیہ کی فریاد اب بھی صدائے باز گشت بنکر اُن کا پیچھا کر رہی ہے۔ ثریا بیگم رنجیدہ ہوگئیں اور اپنے مرحوم شوہر کو یاد کرکے رونے لگیں۔

اسلم میاں نے انھیں سمجھایا۔ ان کو زمانے کی خود غرضی اور اس کی برائی سے روشناس کرایا۔ آمنہ کی یاد دلائی اور ان کے احساسات کو جگایا۔

ثریا بیگم کی نفس شرافت نے اپنے گناہ کی سنگینی کا احساس کیا تو ان پر غضب الٰہی کا خوف طاری ہوا۔ اس خوف کی ٹیسوں نے ان کا سکون و قرار چھین لیا۔ وہ دن رات سوچنے لگیں۔ آخر تسلی حاصل کرنے کا انھیں ایک راستہ نظر آیا۔ انھوں نے اسلم میاں کو بتایا کہ آمنہ سے کی گئی ناانصافی کی تلافی کے لئے وہ اسلم میاں کا بیاہ راضیہ سے رچا کر کرنا چاہتی ہیں۔ اسلم میاں خوش ہوئے کہ ماں کے اقدار کی روح مردہ ہونے سے بچ گئی۔ ثریا بیگم کو اس ارادے نے قوت بخشی اور ان کے لئے نیکی کی راہ کھل گئی۔ جس پر چلتے ہوئے ثریا بیگم اور اسلم میاں باڑے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

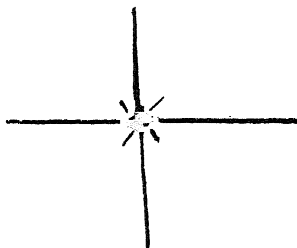
حیرانی اور سرد مہری نے ان کا استقبال کیا۔ آمنہ کے غم کی چنگاری جو وقت کی راکھ میں دبی پڑی تھی سلگ اٹھی۔ غم و غصہ کے سمندر سے بخارات

اُٹھنے لگے لیکن جب ثریا بیگم نے انھیں اپنے آنے کا مدعا بتلایا تو بارڑے
کا ماحول یکسر بدل گیا۔ باڑے کے ادلتے بدلتے ماحول نے راضیہ کو حیران
کر دیا۔ اس نے سر اُٹھا کر اپنی ماں کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔ آمنہ کی آواز
صدائے بازگشت بن کر اس کے کانوں میں گونجتی رہی ۔

"منی تم اپنی ساری کڑواہٹ پی جاؤ اور خوش خلقی کی صفت
کو اپنا لو۔ پھر دیکھو تمہارے لئے چاروں طرف مسرّت پھیلانا کتنا آسان
ہو جاتا ہے"۔

# دیکھو میں زندہ ہوں!

آزر اگر وقارِ صداقت کی بات ہے
اعلانِ حق وہ ہے جو سرِ دار ہو گیا



جنوری کی ایک ایسی ہی شام تھی - سورج ڈھل رہا تھا - ہوا میں خنکی سی آگئی تھی - سریندر سنگھ کو یہ موسم بہت بھاتا تھا - وہ ہر شام میرے گھر کے صحن میں بیٹھ کر بہار کے موسم کے گیت گاتا - اس کی آواز میں اس کے علاقے کا جوش و ولولہ ہوتا۔ سریندر سنگھ ہندوستان کے اس علاقے کا رہنے والا تھا، جہاں کی زمین ہمیشہ سرسبز و شاداب رہتی، جہاں صنعتوں کی ترقی کی تیز روی جاری رہتی، جہاں کے لوگ ہمیشہ ناچتے گاتے اپنی مستی میں مگن رہتے -

سریندر سنگھ جس کمپنی میں کام کرتا تھا اس کمپنی کو ہماری ریاست میں بھاری بھرکم پرنٹنگ مشینیں نصب کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تھا - وہ اسی کام کے سلسلے میں آیا ہوا تھا - وہ جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہ میرے گھر کے قریب تھی - ہمارے علاقے کے لوگ اُسے بہت پسند تھے - وہ کہا کرتا -

"بھئی - میں ہندوستان کی تمام ریاستیں دیکھ آیا ہوں لیکن جو گنگا جمنی تہذیب میں نے یہاں دیکھی ہے اس کا جواب نہیں"

اُس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ شام ہوتے ہی میرے گھر آتا - جھوم جھوم کر اپنے وطن کے گیت گاتا - کبھی کبھی اپنے جوان بیٹے وجیندر سنگھ کو یاد کر کے

اداس ہوجاتا۔ آج بھی وہ بہت اداس تھا۔ میں نے پوچھا۔

"آج کیوں اتنے اداس ہو؟ کیا وجیندر سنگھ یاد آرہا ہے؟"

اس نے کہا "نہیں جی ۔ میری یہ اداسی میرے گھر والوں کے لئے
نہیں ہے۔ اُن وطن پرست مرنے والوں کے لئے ہے جو دہشت پسندوں کے ہاتھوں
ختم ہوگئے ہیں"۔ پھر آنکھوں میں آنسو لئے مجھ سے سوالات کرتا۔

"بتاؤ بھائی ۔ ملک کا بٹوارہ ہوا تو ہم نے کیسی کیسی قربانیاں دیں اب
علاقوں کا بٹوارہ کیا معنی رکھتا؟ آخر یہ لوگ علیحدہ علاقہ کیوں چاہتے ہیں بھائی؟
ملک کو مزید بٹوارے سے بچانے کے لئے ہمیں اور کتنی قربانیاں دینی پڑیں گی؟ یہ
لوگ تو اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں جی"

وہ اپنے سوالات میں اتنا کھویا ہوا رہتا کہ میری خاموشی کا وہ کوئی
نوٹس نہ لیتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں اس کی شخصیت کے بارے میں
سوچتا رہتا۔ کتنے اونچے خیالات ہیں سریندر سنگھ کے۔ کتنا پیار ہے
ہے اُسے اپنے ملک سے اپنے علاقے سے اپنے علاقے کے لوگوں سے۔

دوسری شام جب وہ معمول کے مطابق میرے گھر نہیں آیا تو مجھے بے چینی
محسوس ہوئی اور تشویش بھی ــــــ پھر اسی تشویش کے جذبے نے مجھے اس کی ہوٹل
میں پہونچا دیا۔ میں اس کے کمرے کے قریب پہونچا تو اس کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔
میں تیزی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا ۔ دیکھا اس کے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی
ہوئی ہے۔ اور وہ درد کی شدت سے کراہ رہا ہے۔

"یہ کیا ہوگیا ہے سریندر سنگھ ہاتھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

میں نے پوچھا۔

"کیا بتائیں بھائی۔ آج صبح اخبار میں یہ المناک خبر پڑھی تھی کہ دہشت پسندوں نے ایک بس کے مسافروں پر گولیوں کی بوچھار کر دی اور سارے کے سارے مسافر مارے گئے ہیں اس وحشتناک خبر سے سارا دن متاثر رہا۔ ان مسافروں میں بچے بھی تھے بوڑھے بھی مرد بھی تھے عورتیں بھی۔ کام کے دوران بھی ان کا خیال آتا رہا کہ اچانک مشین کا ایک بھاری حصہ میرے ہاتھ پر گر پڑا" پھر سرد آہ بھر کر کہا۔

"میرا یہ درد تو کم ہو جائیگا جی ——— اُن لوگوں کا کیا ہوگا۔ جن کے دل ایک نا مندمل ہونے والے زخم سے مجروح ہو گئے ہیں"

میں ایکبار پھر اس کے دردمند جذبات سے متاثر ہوا ——— اس کا درد ——— اس کا غم ——— اس کی تنہائی ——— میں برداشت نہ کر سکا۔ اُسے مجبور کیا اور اپنے گھر لے آیا۔ میرے گھر اس کا علاج ہوتا رہا۔ ہر صبح میں اُس کو جرّاح کے پاس لے جاتا اس کی پٹی بدلواتا۔ اور جب میں دفتر چلا جاتا تو میری غیر موجودگی میں میرا بیٹا سندیپ اس کا خیال رکھتا۔ سندیپ کے مدرسے کی چھٹیاں چل رہی تھیں وہ تمام دن سریندر سنگھ کے ساتھ رہتا اس طرح وہ آپس میں گھل مل گئے تھے۔

میرے لڑکے سندیپ کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ پھر بھی وہ موٹا چشمہ استعمال کرتا تھا۔ سریندر سنگھ نے پوچھا۔

"سندیپ اتنا موٹا چشمہ کیوں استعمال کرتا ہے جی؟"

"اس کی آنکھیں بہت کمزور ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ جیوں جیوں اس کی پڑھائی بڑھتی جائے گی آنکھیں اور زیادہ کمزور ہوتی جائیں گی۔ میں بہت

پریشان، ہوں سریندر سنگھ"
"تشویش کی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔ میرے شہر میں آنکھوں کا بہت بڑا دواخانہ ہے، وہاں کا مشہور ڈاکٹر اجیت سنگھ نے کئی بچوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا ہے اُن کی بینائی اچھی ہوگئی ہے"۔
"اب ڈاکٹر اجیت سنگھ سے کیسے ملیں؟" میں نے پوچھا۔
"لو۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر اجیت سنگھ ایک سمینار کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ کل ہی ملاقات کرلو جی"۔
دوسرے دن میں نے ڈاکٹر اجیت سنگھ سے ملاقات کی اور سندیپ کی آنکھوں کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔
"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ آپریشن میرے دواخانے میں ہوگا۔ تمہیں میرے شہر کچھ دنوں کے لئے آنا ہوگا"۔
"اُف! وہ دہشت زدہ علاقہ" میں نے اپنے آپ سے کہا "لیکن سندیپ کی آنکھوں کا آپریشن؟ وہ بھی تو ضروری ہے" میں نے سوچا۔
جب گھر پہونچا تو سریندر سنگھ کو اپنا منتظر پایا۔ اُسے ڈاکٹر اجیت سنگھ سے اپنی ملاقات کا حال سُنایا۔ اور ساتھ ہی اپنی پریشانی کا اظہار بھی کیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔
"کیوں فکر کرتا ہے بھائی۔ ابھی سریندر سنگھ زندہ ہے۔ پھر دنگے فساد ہمیشہ نہیں ہوتے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب اپنے وطن جاؤں گا تو سب سے پہلے ڈاکٹر اجیت سنگھ سے ملوں گا۔ سندیپ کی آنکھوں کے آپریشن کا دن

مقرر کروں گا اور تمہیں اطلاع دوں گا۔"

مجھے مطمئن نہ پاکر وہ مسکرانے لگا۔ "اے بھائی۔ مجھ پر بھروسہ کر۔ رواداری اور محبت ہماری تہذیب کی بنیاد ہے جی۔ ہم اپنے مہمانوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

اب سریندر سنگھ کا ہاتھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کا کام بھی ختم ہو گیا تھا وہ بہت خوش رہنے لگا پھر میرے دل میں امید کی نئی جوت جلا کر وہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔ ہم نے اس کی کمی بہت محسوس کی۔ میرے لیے وہ رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ بہت جلد اس کا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس نے لکھا کہ اس کا شہر پر امن ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر اجیت سنگھ سے ملاقات کا ذکر کیا اور سندیپ کی آنکھوں کے آپریشن کی تاریخ لکھ بھیجی۔ آخر میں وہ اپنے شہر جلد پہنچنے کی تاکید بھی کی۔

میں سندیپ کو ساتھ لیے مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔

سریندر سنگھ کا شہر واقعی بہت سہانا تھا۔ لہلہاتے کھیت۔ ندیاں وہ جو گیت ہم کو سنایا کرتا تھا۔ ان گیتوں میں اس کے شہر کی حقیقی منظر کشی ہوتی تھی۔ ہم جہاں سے گذرتے ایسا محسوس ہوتا کہ صحت مند زندہ دل نوجوان بوڑھے گاتے مسکراتے ہمارا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

سریندر سنگھ نے تو ہمارے پہنچنے کی خوشی میں جشن منا ڈالا۔ اس دن شام ہوتے ہی سارے پڑوسی جمع ہو گئے۔ سب نے مل کر بھانگڑا ناچا۔ گایا۔ خوب دھوم مچائی۔

وقت مقررہ پر سندیپ کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا۔ میں بہت خوش تھا اور سریندر سنگھ کا ممنون بھی۔ اس نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

دوسری شام مجھے اپنے شہر لوٹ جانا تھا۔ لیکن شام ہونے سے پہلے ہی یکایک فساد پھیل گیا۔ سارے علاقے میں وحشت طاری ہوگئی۔ دہشت پسند سریندر سنگھ کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ خوف کے مارے میرا چہرہ فق ہوگیا۔ سریندر سنگھ میرے قریب آیا اور کہا "ارے۔ تو فکر نہ کر بھائی۔ ابھی سریندر سنگھ زندہ ہے۔"

سریندر سنگھ اور اس کا بیٹا وجیندر سنگھ شیر کی طرح غراتے، بندوقیں پکڑے باہر کی طرف لپکے۔ میں نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رُکے نہیں —— وہ بھلا کیسے رُکتے، اُن میں انسانیت کا وہ جذبہ اجاگر ہوگیا تھا جو دوسروں کو دُکھی دیکھ کر خود بھی دکھی ہو جاتے ہیں وہ اپنی زندگی بھی اس جذبۂ انسانیت پر قربان کرنے تیار تھے۔

باہر گولیوں کے چلنے کی آوازیں آتی رہیں —— انسان جانوروں کی طرح نشانہ بنائے جاتے رہے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ لاشیں روندی جاتی رہیں —— چیخ و پکار سے آسمان لرزتا رہا۔ پھر ایک شور اٹھا۔ دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس سے میری روح لرزنے لگی۔ زخمی سریندر سنگھ اپنے بیٹے وجیندر سنگھ کی لاش ہاتھوں پر اٹھائے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ پیچھے روتے چیختے لوگوں کا ہجوم تھا۔ سریندر سنگھ کی آنکھوں میں گہری اُداسی تھی۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہونچا ——

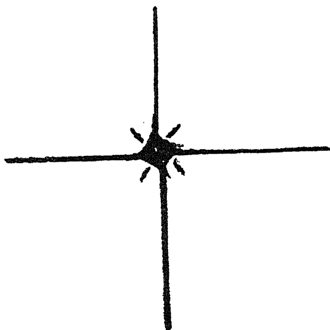
"سریندر سنگھ بتاؤ۔ وجیندر کو کیا ہوا؟ کیا وہ ——"

"ہش" سریندر سنگھ نے میرا جملہ قطع کیا ــــ وجیندر کو کچھ نہیں ہوا ــــ دہشت پسندوں کو مار کر مرجانے والے ــــ امر ہوتے ہیں"

سب رونے لگے۔ سریندر سنگھ نے اپنے بیٹے کی لاش زمین پر رکھ دی۔ سندیپ دوڑ کر سریندر سنگھ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ سریندر سنگھ کی نظریں سندیپ کی نظروں سے ٹکرائیں آسے ایسا محسوس ہوا جیسے وجیندر سنگھ اس سے کہہ رہا ہو ــــ "دیکھو میں زندہ ہوں"

# قد آور

کانٹوں نے چھید ڈالا تھا اس کا بدن مگر
الزام اس کے قتل کا بادِ صبا پہ تھا



قدسیہ کے رشتے داروں اور دوستوں کا دائرہ سمندر کی طرح وسیع تھا۔ سمندر کے ساحلوں پر ۔۔۔ سمندر کے شہروں میں ان کے رشتے دار اور دوست بستے تھے۔ کبھی کوئی رشتہ دار یا کوئی دوست بیرون ملک سدھارتا یا پردیس سے آجاتا یا پھر کسی کے گھر شادی رچتی یا سالگرہ کی تقریب ہوتی تو دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ رشتے داروں کا پاس و لحاظ اور اخلاق و آداب کی پذیرائی قدسیہ کو ان دعوتوں میں لے جاتی۔ پھر وظیفہ پہ ہٹ جانے کے بعد وہ گھر میں بیٹھی بیٹھی بادب گئی تھیں ان کے وظیفہ کی کاروائی کسی گھاٹی کی پر پیچ راہ کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ کاروائی جلد ختم ہو اور وہ پردیس میں بسنے اپنے بیٹے سے جا ملے۔

اکیلے پن سے گھبرا کر قدسیہ نے ایک سات سالہ لڑکے انور کو ملازم رکھ لیا۔ وہ ان کی لاٹھی بنا ساتھ ساتھ پھرتا۔ لیکن انور کا ساتھ قدسیہ کی زندگی کا نیا تجربہ بن گیا۔ انور کا وجود ایک کسوٹی بن گیا۔ چند نام نہاد اعلیٰ سوسائٹی کے افراد کیلئے جن کی شائستگی اور تہذیب کھوٹے سونے کی طرح آشکار ہو جاتی۔

قدسیہ کے ایک دوست کے ہاں شادی کی دعوت تھی۔ چوکیوں پر

طرح طرح کے لوازمات سجے ہوئے تھے انور قدسیہ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔
اتنے میں میزبان صاحبہ آ پہنچیں اور انور کو دیکھا تو ان کی بھوئیں تن گئیں۔ کہنے لگیں۔

"اٹھو۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ چلو میرے ساتھ"

اور انور کو دور نوکروں کی صف میں لے جا کر بٹھا دیا۔ قدسیہ کی طبیعت مکدّر ہو گئی انھوں نے کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ جانتی تھیں کہ میزبان صاحبہ سے بحث کرنا بیکار ہے۔ کیونکہ آدابِ محفل کے نام سے انھوں نے اپنے آپ کو سج لیا ہے اور کج فکری ان کی طبیعت میں رچ بس گئی ہے۔ قدسیہ نے سوچا کہ بدبختی تو ابلیس پر چھائی تھی۔ آگ سے پیدا ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو برتر جانا اور کھنکھناتی ہوئی مٹی کی مخلوق کو ذلیل ٹھہرایا۔ حضرتِ انسان نے تو یہ بدبختی خود پر لادلی ہے اور آسمانی کتاب میں دیا گیا بھائی بھائی کا سبق بھلا دیا۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز" نماز کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اخلاقی اقدار کی کشتی کو اس کے ناخداؤں نے ذات پات، رنگ نسل، اعلیٰ ادنیٰ کے گرداب میں پھنسا دیا۔

اس دعوت کی کڑواہٹ کو ذہن ابھی بھلا نہ پایا تھا کہ قدسیہ کی ایک رشتہ دار نے فون پر اطلاع دی کہ ان کے نواسے کی سالگرہ ہے۔ قدسیہ کو بچے ہمیشہ اچھے لگتے اسی لئے انھوں نے یہ دعوت قبول کر لی۔

سالگرہ کا دن آیا۔ جس بچہ کی سالگرہ تھی وہ گود میں ایک اعلیٰ نسل کے سفید کتے کو اٹھائے اپنی نانی کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ قدسیہ نے Happy brith day کہتے ہوئے اس بچہ کو پیار کیا اور

تحفہ تھما دیا۔

"یہ کون ہے۔؟" بچہ نے انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے پوچھا۔

"یہ انور ہے۔ میرے ساتھ رہتا ہے۔"

"یہ آپ کو کیا پکارتا ہے" بچہ نے معصومیت سے پھر پوچھا۔

"یہ مجھے ماں جی کہہ کر پکارتا ہے بیٹے" قدسیہ نے جواب دیا۔

یہ سُنکر بچہ کی نانی نے قہقہہ بلند کیا۔ کہنے لگیں۔

"یہ ان کے بڑھاپے کی اولاد ہے بیٹا تبھی تو ساتھ لئے پھرتی ہیں"

ان کے قہقہہ میں چھپے طنز کو قدسیہ نے محسوس کیا اور سوچا طنز کے تیر چلانا ان کی عادت ہے اب اس عمر میں ان کے ذہن کی تربیت کون کرے۔ قدسیہ نے ایک اچٹتی نگاہ بچہ کی گود میں بیٹھے کتے پر ڈالی اور انور کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔

سالگرہ کا کیک کٹنے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بچے رنگ برنگی کاغذ کی ٹوپیاں پہنے گھیرا باندھے کھڑے رہے کیک پر لگی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں بجھتے ہی تمام بچے تالیاں بجاتے ہوئے Happy brith day to you گانے لگے۔ سب کو کیک بانٹا گیا۔ بچوں کو کیک کے ساتھ چھوٹی چھوٹی رنگین کاغذ کی تھیلیاں تقسیم کی گئیں جن میں قسم قسم کے چاکلیٹ کاغذی گھانس کے درمیان چھپے ہوئے تھے۔ اچھل کود میں ایک بچہ کی ٹوپی فرش پر گر پڑی۔ دوسرے نے اُس کو ٹھوکر ماردی، ٹوپی بھڑک کر فرش کے کونے میں دب گئی۔ بچے شور

مچاتے باہر کی جانب بھاگ گئے۔ انور کچھ دیر فرش کے کونے میں دبی پڑی ٹوپی کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب پہونچا کچھ دیر کی کشمکش کے بعد اس نے وہ ٹوپی اٹھائی اور پہن لی۔ ٹوپی پہنتے ہی انور کا چہرہ کھل اٹھا۔ یہ دیکھ قدسیہ نے کہا۔

"جاؤ تم بھی باہر بچوں کے ساتھ کھیلو"

انور خوشی سے ناچتا باہر کی جانب دوڑا، اور بچوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس کو دیکھ کر بچوں نے اپنا کھیل روک دیا اور انور کی ٹوپی کو دیکھنے لگے جو پھٹی ہونے کی وجہ سے اس کے سر پر بے تکی لگ رہی تھی۔ اب بچوں کو کھیل کا نیا مشغلہ ہاتھ آیا وہ انور کی ٹوپی پر دھول جمانے لگے۔ ٹوپی پھٹ کر زمین پر گر پڑی۔ انور دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو ڈھانپے رونے لگا۔ دور کھڑے ایک لڑکے نے یہ تماشہ دیکھا تو اس کا نرم و نازک دل تلملا اٹھا وہ انور کے قریب آیا اور اپنی چاکلیٹ کی بٹی انور کو دے دی۔ چاکلیٹ کی کشش نے انور کے ذہن سے ٹوپی کے واقعہ کو بھلا دیا۔

کچھ عرصہ اور بیت تھا۔ قدسیہ کی نند نے دعوت نامہ بھیجا۔ نند کا لڑکا اور بہو بیرون ملک سے کچھ دن قیام کے لئے پہلی بار آئے تھے۔ ان کے تعارف کے لئے دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قدسیہ اپنی نند کو بہت چاہتی تھی۔ وہ دعوت میں پہنچ گئی۔ جب نند نے انور کو دیکھا تو پوچھا۔

" اچھا اچھا یہ وہی لڑکا ہے جو آج کل آپ کے ساتھ رہ رہا ہے کیا نام ہے اس کا" ؟

"اس کا نام انور ہے"

"انور! یہ تو آپ کے بھائی کے لڑکے کا نام ہے"

"ہاں ہے" قدسیہ نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر آپ اسے کیا پکارتی ہیں؟"

"کیوں؟ میں انور ہی پکارتی ہوں"

"ارے کسی دوسرے نام سے پکارو اسے۔ ورنہ آپ کی بھابھی بُرا مان جائے گی"۔

"کیوں بُرا مانے گی؟ کیا ایک نام کے کئی لوگ دنیا میں نہیں ہوتے؟"

"لیکن یہ آپ کا نوکر ہے۔ اب نوکر اور بھتیجے کو آپ ایک ہی نام سے پکاریں گی؟"

قدسیہ نے انور پر ایک نظر ڈالی جو ساری ذلتوں سے بے نیاز پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی نند کو دیکھ رہا تھا۔ قدسیہ نے انور کو اپنے قریب کر لیا اور کہا۔

"اسی لئے تو میں اس کو زیادہ چاہتی ہوں کہ اس کا نام بھی انور ہے۔ ویسے میرے بھتیجے نے اپنے نام کے سارے حقوق محفوظ کہاں کرائے ہیں کہ دوسروں کو اس نام سے پکارا نہ کروں"۔

قدسیہ کا خیال تھا کہ ان کی نند کا قہقہہ بلند ہوگا لیکن وہ ناراض ہوگئیں اور اپنے کاندھے اچکا! تریہ جا وہ جا۔ قدسیہ نے نند کو روٹھ کر جاتا ہوا دیکھا تو مسکرا کر دل میں کہا۔

"اب مجھے اس نند کی عقل کو گہری نیند سے بیدار کرنا ہوگا۔ اس کو بتانا ہوگا کہ ذلت و ہتک کے تیر کسی کے دل کو چیر سکتے ہیں کسی کو یاس و نامرادی کی گہری کھائی میں ڈھکیل سکتے ہیں۔ جہاں سے پھر کوئی ہاتھ انھیں سہارا دیکر اوپر نہیں اٹھائے گا۔"

اس سلسلہ کی ایک اور دعوت خود قدسیہ کے گھر پر تھی۔ ان کی چچازاد بہن جو سہیلی بھی تھی ہمیشہ کیلئے اپنا وطن چھوڑ کر بیرون ملک سدھار رہی تھیں۔ قدسیہ نے کچھ اور رشتہ داروں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔

سب لوگ جمع ہو گئے تو بچوں نے اپنا گروپ الگ بنالیا۔ وہ اب انور سے مانوس ہو گئے تھے۔ انھوں نے انور کو بھی اپنے کھیل میں شریک کرلیا۔ اور پھر باہر لان پر ادھم مچاتے رہے۔ پھر کسی بچے کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ سب رونے کی آواز پر متوجہ ہو گئے۔ کچھ عورتیں دوڑ کر بچوں کے قریب پہنچ گئیں۔

"سچ سچ بتاؤ کس نے گرایا ہے اسے؟" بچہ کی دادی نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"انور نے" سب نے ایک آواز میں جواب دیا۔

انور ڈر گیا "نہیں نہیں۔ میں نہیں گرایا" کہتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔

دادی نے انور کو پکڑا۔ ان کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور چٹاخ کی آواز کے ساتھ انور کے گال پر جم گیا۔ انور گال سہلا کر رونے لگا۔ دادی

غصہ میں بڑبڑاتی رہیں۔

"جھوٹ بولتا ہے۔ لاڈوں میں گلتن ہو گیا ہے۔ نہ جانے قدسیہ کہاں سے پکڑ لائی ہے اس آفت کو۔"

اس رات قدسیہ بہت دیر تک انور کو سمجھاتی رہیں۔ جھوٹ کی برائی اور سچ کی طاقت بتاتی رہیں۔ اتنے میں ٹیلی ویژن سے خبریں آنی شروع ہو گئیں۔ وہی چاروں طرف پھیلی افراتفری، خون خرابے کی خبریں۔

"آتنکوادیوں نے سولہ بسوں پر گولی چلادی۔ بس میں بیٹھے سارے مسافر مارے گئے" انور یہ سُنکر چونک پڑا۔ اور پوچھا۔

"ماں جی آتنکوادیوں نے انھیں کیوں مارا؟ کیا سارے کے سارے مسافر جھوٹے تھے؟"

قدسیہ لاجواب ہو گئیں وہ کیسے کہتیں کہ آتنکوادی تو زور دیوانے ہیں جو اپنے ہی علاقے والوں کو خون کے آنسو رلا رہے ہیں۔ جب اُن سے جواب بن نہ پڑا تو وہ جھنجھلا گئیں اور ٹیلی ویژن بند کر دیا۔

اب قدسیہ نے ان لوگوں کے ہاں دعوت میں جانا چھوڑ دیا جن کی مثال ان گدھوں کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان میں کیا ہے جو چمگادڑوں کی طرح اپنی آنکھیں جہالت کے اندھیرے میں کھول دیتے ہیں اور علم کی روشنی میں سکیڑ لیتے ہیں۔

ایک دن قدسیہ کی خالہ ملنے چلی آئیں۔ اس ضعیفی میں بھی وہ اپنے رشتے داروں کی برابر خبر گیری کیا کرتیں۔ نورانی چہرہ، پیشانی پہ سجدوں کا گٹھا۔ ان کے شوقِ عبادت کا مظہر۔ زاہدوں جیسا لباس۔ قدسیہ جانتی تھیں کہ خالہ نے

ظاہری طور پر عبادت کا جامہ نہیں پہنا ہے بلکہ ان کا نفس بھی اتنا ہی پاکیزہ ہے۔

خالہ نے پوچھا "کہاں رہتی ہو قدسیہ آج کل نظر نہیں آتیں ؟"

"جی بس تھک گئی ہوں خالہ ان دعوتوں سے"

خالہ نے انور کو دیکھا تو قریب بُلایا سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"تو یہ وہی انور ہے جسے تم بہت چاہتی ہو ؟"

"یہی محبت تو میرے جی کا جنجال بن گئی ہے خالہ ۔ جسے دیکھو میرا مذاق اڑا رہا ہے ۔ جہاں جاؤں بیچارہ انور غصّے اور نفرت کی زد پر رہتا ہے"

"یہ دنیا تو اندھے آئینے میں دیکھنے کی عادی ہے بیٹی اِن کو کیا دکھائی دے گا۔ وہ کیا جانے غریب کا ساتھ دینا کتنا مشکل ہے ۔ قدم قدم پر قدرت ہمارا امتحان لیتی ہے۔ غم آزمائش کی کٹی پھٹی راہوں سے بچتے ہوئے سیدھی راہ چلنا بہت مشکل ہے بیٹی"۔ پھر پیار سے قدسیہ کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو تو بہت اچھی ہے قدسیہ ۔ بیکار کی باتوں سے اپنا دل بھاری نہ کیا کر"

قدسیہ نے خالہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ کوئی تو ہے جو اس کو مایوسی کے تصورات سے علٰحدہ کر کے بلند ہمتی کے جذبے سے آشنا کر رہا ہے۔

کئی دعوتیں ایسی بھی ہوتیں جہاں انور کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا ۔ ایسی ہی ایک دعوت نرملا کی شادی کی تھی۔ نرملا دیپو کی بہن تھی ۔ جو انور کی جماعت میں پڑھتا تھا۔

دیپو کی ماں محلہ تمام میں شادی کا نیوتہ دیتی پھری ۔ وہ قدسیہ کے گھر بھی آئی ۔ کُم کُم کی ڈبیا کو کھولا پھر کچھ سوچ کر بند کر دیا۔ قدسیہ کو بڑی عزت سے شادی کا رقعہ دیا اور کہا۔

"بہن جی شادی میں ضرور آئیے اور اس نٹ کھٹ کو لیے یہ ہمارے دیپو کا دوست

ہے۔ قدسیہ نے شادی میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا۔ کیونکہ حق ہمسائیگی اپنے مقام پر اہمیت رکھتی ہے چاہے دعوت دینے والا ہم مسلک ہم عقیدہ ہو نہ ہو۔

شام کی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دیپو کے گھر کے سامنے کی پکی سڑک دور دور تک گوبر اور لال مٹی سے لیپ دی گئی تھی۔ عین دروازے کے سامنے سڑک پر ناریل کے پتوں کا منڈپ بنایا گیا تھا۔ جس کے کھمبے کنکھمبر اور چاندنی کے پھولوں سے سجائے گئے تھے۔ ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی بلب جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ منڈپ میں ایک جانب شگون کے لئے سری رامچندر جی ۔ سیتا جی کی تصویر آویزاں تھی۔ منڈپ کے آس پاس شطرنجیاں بچھا دی گئی تھیں جن کے اطراف قناطیں تان دی گئی تھیں اوپر کوئی چھت نہیں تھی۔ چاند اور ان گنت ستارے ضیاء پاشی کر رہے تھے۔ قدسیہ مہمانوں کے درمیان جا بیٹھیں۔ انور دیپو کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا۔

نرملا شادی کی سفید ساڑی پہنے ماتھے پر بڑا ٹیکا لگائے بال پھولوں کی چوٹی سے سجائے دولھا کے قریب منڈپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پنڈت منتر جپ رہے تھے۔ ماحول میں گھی کے جلنے کی بو پھیل رہی تھی۔ پنڈت کا اشارہ پاتے ہی مردنگ زور زور سے بجنے لگا۔ نرملا کا دولھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی سارے براتی ہاتھوں میں اکشنتلو (ہلدی ملے چاول) لئے قریب پہنچ گئے۔ دولھا نے دولھن کے گلے میں منگل سوتر باندھا۔ براتیوں نے دولھا دلھن پر اکشنتلو پھینکے۔ یہ دیکھ کر قدسیہ کو اپنے بیٹے کی شادی کا وہ سماں یاد آ گیا جب دولھا اور دولھن نے ایک دوسرے پر پھول ملے چاول پھینکے تھے۔ قدسیہ نے سوچا ایک ہی ملک میں رہنے والوں کے رسم و رواج کس طرح ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

اب کھانے کا اہتمام شروع ہوا۔ شطرنجیوں پر پترولیوں کی قطاریں سجادی
گئیں۔ ہر پترولی کے قریب ایک اسٹیل کی گلاس رکھ دی گئی۔ لوگ بلاتفریق شطرنجیوں
پر بیٹھ گئے۔ قدسیہ نے بھی ایک پترولی سنبھالی۔ انور کہیں سے بھاگتا ہوا آیا اور قدسیہ
کے قریب بیٹھ گیا۔

سب سے پہلے نمک کی چٹکی پترولی پر ڈالی گئی پھر یکے بعد دیگرے مرد
عورتیں اسٹیل کے بیسن اور بکیٹیں اٹھائے ان کی جانب آنے لگے۔ اچار۔ موتی چور
کے لڈو۔ قسم قسم کے سالن۔ گرم گرم کھانا۔ سانبر۔ پاپڑ۔ پترولیوں میں پروستے رہے۔
دیپو شرمایا شرمایا سا آیا اور انور کی پترولی میں ایک اور لڈو رکھ کر بھاگ گیا۔ انور
خوشی سے پہلو بدلنے لگا۔ دہی اور چھاچھ کی تقسیم پر دعوت ختم ہوئی۔

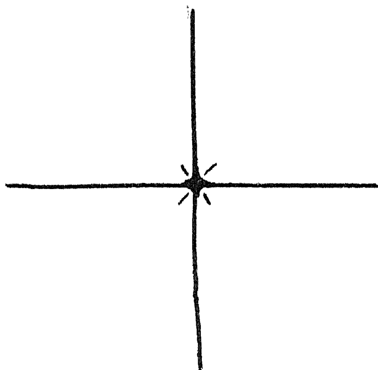
قدسیہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے جوڑے سے کلپس نکال رہی تھیں۔
پاس کھڑا انور اب بھی چہک رہا تھا۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے قدسیہ نے سوچا۔
بچہ ہے بچہ ہو یا بڑا وہ اپنے ہم عمر اور برابر والوں کی صحبت میں خود کو آزاد محسوس کرتا
ہے۔ انور تو ابھی بچہ ہے۔ وہ ان ساری ذلتوں سے ناآشنا ہے جو لوگوں نے اسے
بخشی ہیں۔ انور نے جیسے قدسیہ کے دل کی آواز سن لی۔ کہنے لگا۔

"ماں جی۔ بس ہم دیپو جیسی دعوتوں میں جایا کریں گے وہ دوسری دعوتیں
مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

قدسیہ نے چونک کر نظریں اٹھائیں آئینے میں انور کا عکس قد آور
نظر آرہا تھا۔

# رشتہ حق شناسی کا

کرے کوئی تو مری نیکی و بدی کا حساب
کوئی تو مجھ سے کہے میں سزا کے لائق ہوں



شعیب اپنی بہن رعنا کی شادی کی خبر ہری چاچا کو دینے جب ان
گھر گیا۔ تو اس وقت ہری چاچا سندھیا کی پوجا میں مصروف تھے اس لئے وہ ہال سے
خوبصورت بالکنی میں جا بیٹھا۔ اس کی نظریں افق کی جانب اُٹھ گئیں جہاں غسل
آب پاکر شفق کی رنگین پردوں سے جھانکتا ہلال بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔
شعیب نے سوچا ان گنت صدیوں کے گزر جانے کے باوجود ہلال کی دلکشی اور دلفریبی
کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ شادی کے بعد
رعنا کی زندگی میں بھی اسی طرح خوشیوں کا نور پھیلا رہے۔

پوجا ختم ہونے پر ہری چاچا شعیب کے مقابل آ بیٹھے۔ شعیب نے انھیں
رعنا کی شادی کی خبر سنائی۔ اس خبر سے خوش ہو کر ہری چاچا نے اپنی بیوی
شوبھا کو آواز دی کہ مٹھائی لے آئیے۔ شوبھا تشتریوں میں مٹھائی اور کھجوریاں سجا کر
لائیں اور خود بھی تفصیلات جاننے وہیں بالکنی میں بیٹھ گئیں۔

شعیب کہنے لگا "آج امجد چاچا ہمارے گھر آئے تھے۔ بہت متاثر
ہے۔ مجھے اور رعنا کو گلے لگایا۔ یہی کہتے رہے۔ بیٹا جو بھی ہوا ہے بھول جاؤ
میں رعنا کی شادی اپنے لڑکے شہزاد سے مقرر کر گئے ہیں" پھر حیرانی

سے پوچھا "امجد چاچا میں اس تبدیلی کی وجہ کیا وہ حالیہ تلخ حادثہ ہے جو ہری چاچا! جوان پر گزرا ہے یا یہ ہمارے خون کا رشتہ ہے جو اٹوٹ ہوتا ہے"

یہ سن کر ہری چاچا اور شوبھا چاچی مسکرائے۔ ہری چاچا نے کہا۔

"بیٹا یہ سچ ہے کہ دولت کی افراط نے امجد کی آنکھوں پر خود غرضی کی پٹی باندھ دی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک معمولی عورت کی اعلیٰ نفسی کے مظاہرے سے متاثر ہو کر اُس نے وہ پٹی کھول پھینکی ہے۔ اس عورت کا تم سے یا امجد سے کوئی خون کا رشتہ نہیں پھر بھی اُس نے حق شناسی کے اُس رشتے کو خوب نبھایا ہے جس کے بنا پر خون کے رشتے کی طرح ایک انسان کا حق دوسرے انسان پر لازم ہو جاتا ہے"۔

ہری چاچا کی نظریں افق کے اُس پار اس خوبصورت ہلال کو ڈھونڈنے لگیں جو کرۂ ارض کے پیچھے کہیں ڈوب گیا تھا۔ شعیب سوچ میں ڈوبے رہے کہ ہری چاچا کس خاتون کا ذکر کر رہے ہیں پھر اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے پوچھا۔

"ہری چاچا! آپ کا اشارہ خانم کی جانب تو نہیں؟"

ہری چاچا پھر مسکرائے اور کہا "اب جبکہ تم نے خود خانم کا نام لے لیا ہے اور رعنا کی خوشیوں کی خاطر امجد کے گلے لگ چکے ہو تو بہتر یہی ہوگا کہ تمہیں وہ سب کچھ بتلا دوں جس کا ذکر میں نے آج تک نہیں کیا ہے"۔

پھر کہا "سنو۔ تمہارے والد ابراہیم کا شہر میں ایک چھوٹا سا آکشن ہال تھا۔ اس آکشن ہال میں تمہارے چچا امجد اُن کی مدد کیا کرتے تھے۔ میں اپنے دوست ابراہیم سے ملنے اکثر آکشن ہال جایا کرتا تھا۔ اُس یادگار شام کو بھی میں ابراہیم سے ملنے گیا تھا۔ دونوں بھائی گاہکوں میں اُلجھے ہوئے تھے کہ ناگہاں ایک منظر...

بھگدڑ مچ گئی۔ دوکانوں کے شٹر گرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ شہر میں فساد پھیل گیا ہے۔
اس خبر نے ہم سب کو بوکھلا دیا۔ ہم نے ہراج کے پھیلے ہوئے سامان کو محفوظ کیا اور ابراہیم
کے گھر پہنچ گئے" ہری چاچا کی نظریں افق پر کچھ دیر نہ جانے کیا ڈھونڈتی رہیں پھر
سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ اب بھی حیران پریشان سڑک پر بھاگ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ باہر کا
شور وغل کم ہونے لگا۔ پولیس کی گاڑیاں سڑک پر کرفیو کا اعلان کرتی گھومنے لگیں
سارا ماحول وحشتناک سناٹے میں تبدیل ہو گیا۔ ہماری وحشت دور نہیں ہوئی تھی کہ کسی
عورت کی درد بھری سسکیاں سنائی دیں۔ ہم چونک گئے اور دروازے کی
دراڑ سے باہر کی جانب جھانکنے لگے۔ ہمیں دروازے کے قریب کھڑی ایک
عورت کا پیکر دکھائی دیا۔ اسی وقت پولیس کی ویان کی آواز قریب آتی سنائی
دی۔ اس عورت نے گھبرا کر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ابراہیم نے دروازہ
کھول دیا۔ وہ اندر آ گئی۔ خوف سے اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح
ہانپ رہی تھی۔ اس کی ساڑی پر خون کے دھبے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔"

ہری چاچا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے وہ تکلیف دہ واقعہ اس
وقت بھی ان کی آنکھوں کے آگے گھوم رہا ہو۔ شعیب اور شوکھا چاچی بھی
اس واقعہ سے متاثر ہو کر خاموش بیٹھے رہے۔ جب ان کی محویت ٹوٹی تو انہوں
نے محسوس کیا کہ باہر رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا ہے۔ ہری چاچا کا اشارہ پا کر شعیب
نے بجلی کا کھٹکا دبایا۔ نیچے برآمدے سے نکلتا راستہ باہر کے گیٹ تک روشن
ہو گیا۔ راستے کی دونوں جانب کروٹن کے خوشنما پودے اداس کھڑے نظر

آئے۔ واثقہ کی اداسی ماحول میں پھیل گئی تھی۔ جب بہت دیر تک ہری چاچا خاموش رہے تو شوبھا چاچی نے واثقہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا شعیب۔ میں نے بعد جانا کہ اس عورت کا نام خانم ہے۔ وہ سیدھے ناک نقشے کی سانولی رنگت کی عورت ہے۔ پاس کے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس روز اپنے شوہر کے ساتھ شہر آئی تھی۔ خرید و فروخت کے بعد شام کو وہ دونوں گاؤں لوٹنے والے تھے کہ شہر میں فساد برپا ہو گیا۔ ان کو کچھ سجھائی نہیں دیا۔ لوگوں کو بھاگتا دیکھا تو وہ بھی بھاگنے لگے۔ بھاگتے بھاگتے ایک موڑ پر ان کی بھینٹ فسادیوں سے ہوئی۔ فسادیوں نے لوٹ مار شروع کر دیا۔ خانم کے شوہر نے اپنا مال چھپانا چاہا تو کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ یہ دیکھ کر لوگ چیخنے پکارنے لگے۔ فسادی بھاگ کھڑے ہوئے خانم شوہر کی لاش سے لپٹی روتی رہی کہ پولیس کی سیٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ خانم نے لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور سڑک پر بھاگنے لگی تھی۔ پولیس سے بچتی بچاتی تمہارے گھر تک پہنچ گئی"

واثقہ پھر دروازے پر آ کر رک گیا تھا۔ شعیب کی بے چینی بڑھنے لگی

اس نے ہری چاچا سے پوچھا۔

"ہری چاچا۔ آپ بتلائیے آگے کیا ہوا؟"

"بیٹا شعیب۔ تم اور عنا اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ تمہاری ماں نیک رحم دل عورت تھی۔ وہ خانم کے واقعے سے بہت متاثر ہوئی اور اسے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ خانم ایک سمجھدار عورت ہے اس نے اپنی خدمت سے شبیر کا دل جیت لیا۔ وہ کبھی عنا کو اپنی گود میں اٹھائے پھرتی کبھی

تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں چلنا سکھاتی" ابراہیم کا خیال رکھتی اور تمہاری ماں کی خدمت میں لگی رہتی۔ تمہاری ماں کے ہمدردانہ سلوک نے خانم کے زخموں پر مرہم کا کام کیا"

شعیب نے پوچھا "کیا وہ گاؤں واپس نہیں گئیں؟"

"نہیں بیٹا ۔ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہاں اس کا صرف سسرال تھا اس کا اپنا کوئی رشتہ دار نہیں رہتا تھا ——— کاش وہ گاؤں چلی گئی ہوتی"

"آپ نے سچ کہا ہے کہ میں خانم کے بارے میں اتنی تفصیلات نہیں جانتا تھا۔ لیکن آپ نے کیوں کہا ۔ کاش وہ گاؤں چلی گئی ہوتی" شعیب نے سوال کیا۔

" خانم کی بے غرض محبت کو تمہارے امجد چاچا شک و شبہ کی عینک سے دیکھا کرتے تھے وقت کے ساتھ ان کی بدگمانی بڑھتی گئی لیکن مشکل تو یہ ہوئی کہ وہ اس کا اظہار رضیہ سے کرنے لگے۔ شروع شروع میں رضیہ نے اہمیت نہیں دی لیکن پانی مسلسل پتھر پر گرتا رہے تو سوراخ ڈال دیتا ہے۔ رضیہ آخر ایک عورت تھی۔ شک و شبہ کے تیروں سے اپنے آپ کو بچا نہیں پائی اور وسوسوں کے اندھیروں میں گھر گئیں۔ خانم نے محسوس کیا کہ اس نے رضیہ کی ہمدردی کھو دی ہے وہ بہت دلبرداشتہ ہوئی لیکن حیران رہتی کہ رضیہ اس سے کچھ کہتی کیوں نہیں۔ ویسے امجد کے اکھڑے انداز سے اس نے امجد کی بدگمانی کا اندازہ لگا لیا تھا اور ان کا سامنا کرتے ہوئے جھجکنے لگی تھی"

شعیب نے پوچھا "پھر کیا خانم نے گھر چھوڑ دیا ؟"

"ہاں ۔ ہوا یوں کہ ابراہیم تو ان ساری باتوں سے بے خبر تھے ۔ ایک دوپہر کو جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو حسب عادت خانم کو آواز دی ۔ خانم کو کھانے کے برتن سمیٹنا تھا ۔ وہ برتن سمیٹی اور تیزی سے پلٹی ۔ گھبراہٹ میں برتن یکے بعد دیگرے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے گئے ۔ اسٹیل کے برتنوں کی جھنجھناہٹ سے دالان گونج اٹھا ۔ اس پر ابراہیم نے زور کا قہقہہ لگایا ۔ خانم پہلے گھبرائی پھر وہ بھی ہنسنے لگی خانم کی ہنسی کی آواز سنکر رضیہ اپنے کمرے سے نکل آئی ۔ غصے سے بھوت ہوتی رضیہ کو دیکھ کر خانم کی ہنسی یکلخت رک گئی ۔ رضیہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور وہ آگ پھانک رہی تھی ۔ ابراہیم حیران کھڑے تھے ۔ اپنے خلاف رضیہ کے دل میں پکتے ہوئے لاوے سے وہ بے خبر تھے ۔ آخر رضیہ کے جملوں کی کاٹ سے گھائل ہو کر وہ اس پر برس پڑے ۔ خانم نے مارے شرم کے گھر چھوڑ دیا ۔"

"پھر خانم گئی کہاں ؟" شعیب کی حیرانی بڑھ رہی تھی ۔

شوبھا چاچی نے کہا " اس مصیبت میں وہ میرے گھر آئی تھی لیکن کچھ دیر بعد ابراہیم بھی ہمارے ہاں چلے آئے ۔ انھیں جیسے ہی پتہ چلا کہ خانم بھی یہاں موجود ہے ۔ وہ فوراً باہر نکل گئے ۔ ہم سمجھے ناراض ہو کر گئے ہیں لیکن کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ قاضی صاحب تھے اور دو دوست تھے ۔"

شعیب ہری چاچا کا منہ دیکھنے لگے ۔ ہری چاچا نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ۔

" بیٹا ۔ اس وقت ان کے مشتعل جذبات کو کھلتا دریا کا رخ موڑنے

کے برابر تھا۔ یہ سب واقعات بہت تیزی سے رونما ہوئے۔ لیکن بعد میں ابراہیم کو ان رشتوں سے نبھائے رہنا مشکل ہوگیا۔ رضیہ خانم کے نکاح سے رنجیدہ تھیں ہی خانم بھی اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ ابراہیم پریشان رہتے حالات یہی یوں ناخوشگوار گزر رہے تھے کہ خانم کے ہاں طیب پیدا ہوا۔"

"اس خبر کا ماں پر کیا اثر ہوا شوبھا چاچی؟" شعیب کی آواز میں لغزش تھی۔

"کیا بتاؤں بیٹا۔ وہ خود کو حسد کی آگ میں جھونکنے سے بچا نہ پائی اور اس آگ سے ابراہیم کو بھی بھسم کر دیا۔ ایک دن ابراہیم کے دل پر اس شدت کا حملہ ہوا کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر رضیہ کیا بھی بھی اس غم میں گھل گھل کر مر گئیں۔"

شعیب نے آہستہ سے پوچھا "خانم کا کیا ہوا؟"

شوبھا چاچی کہنے لگیں "بیٹا بھگوان بڑا دیالو ہے۔ وہ ساگر کی تہہ میں رہنے والوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسنے والوں کو، زمین پر چلنے والوں کو ہواؤں میں اڑنے والوں کو سب کو کھلاتا ہے اس نے خانم کے اور طیب کے جینے کا سامان کر دیا۔ خانم نے کسی کی مدد قبول نہیں کی۔ بے سہارگی کے عالم میں نئی ہمت پیدا کی اس نے طے کیا کہ وہ محلے کی ان عورتوں کے گھر جائے گی جو اسکول دفتر اور فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں۔ ان سے کہے گی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے بچوں کی دیکھ بھال اپنے گھر میں کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح خانم کی آمدنی کا سلسلہ شروع ہوا اور رفتہ رفتہ خانم کا گھر "کریچ" بن گیا۔"

باہر ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ شوبھا چاچی نے ہوا کا تھپیڑا محسوس

کیا تو ہری چاچا کے لئے شال لانے اُٹھ گئیں۔ ہری چاچا اور شعیب اپنے اپنے خیالوں میں محو تھے۔ شوبھا چاچی لوٹ آئیں تو ہری چاچا نے شال سے اپنے جسم کو لپیٹتے ہوئے کہا۔

"بیٹا شعیب تم ابراہیم کی طرح سادہ لوح ہو۔ دھندے میں پیسے کا یال نہیں جیسے تمہارا چچا امجد ہے ابراہیم کے بعد آکشن ہال کا دربار امجد نے سنبھالا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا الگ آکشن ہال کھول لیا اور خوب ترقی کی جب امجد کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہونے لگی تو وہ شہر کے دولتمند لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اور اپنے بیٹے شہزاد کا رشتہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی سے جوڑ دیا۔ حالانکہ رعنا اور شہزاد کا رشتہ بچپن میں ابراہیم نے طے کیا تھا جس کو توڑتے ہوئے اس نے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی"

شوبھا چاچی پھر بیچ میں بول پڑیں "بھگوان کی لیلا بھی عجیب ہوتی ہے۔ ظالم کی اولاد اس کے کرم کا پھل بھوگتی ہے تم تو جانتے ہو امجد پر جو حادثہ گزرا ہے۔ امجد کا ڈرائیور ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔ اس نے ہمیں بتلایا کہ ایک رات جب امجد کی بیوی اور اس کی لڑکی ثمینہ سینما کا دوسرا شو دیکھ کر گھر واپس ہو رہی تھیں تو ایک سنسان مقام پر غنڈوں نے ان کی کار کو روک دیا۔ پستول دکھا کر ان سے زیور اور پیسہ چھین لیا۔ پھر ثمینہ کو زبردستی کار سے اتار لیا اور دھمکی دی

کہ شور مچانے پر ثمینہ کو گولی مار دی جائے گی۔ یہ سنکر ڈرائیور کی گھگھی بندھ گئی لیکن ماں پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ مارے غم کے چیخنے لگی۔ ڈرائیور ڈر گیا کہ کہیں وہ لوگ ثمینہ کو گولی نہ مار دیں

ں کی چیخ و پکار کار کی آواز میں گم ہو گئی"

شعیب ثمینہ کے غمگین واقعہ میں کھو گیا۔ اس کو شوبھا چاچی کی آواز
دور سے آتی سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"کار کے گھر پہونچنے پر ایک کہرام مچ گیا۔ امجد سر پکڑ کر بیٹھ گئے سارے محلے میں
یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ محلے والے امجد کے گھر میں جمع ہو گئے سب نے رات
آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے ثمینہ کے لڑکھڑاتے قدموں
نے گھر میں پھیلی خاموشی کو توڑا"

شعیب ہری چاچا کی آواز پر چونک پڑا۔

"سن رہے ہو شعیب۔ اب میں تمہیں خانم کے بارے میں بتلاتا ہوں۔
خانم کی شخصیت کو ابراہیم کا ساتھ، زندگی کے تلخ حادثات، اس کی ہمت اور
ماحول کے اثر نے ابھارا تھا۔ ثمینہ کے حادثے سے وہ بہت متاثر ہوئی اس کے اندر
کی عورت جاگ اٹھی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنے لڑکے طیب کو طلب کیا۔
اپنی زندگی کے واقعات سنائے ثمینہ کے ساتھ گزرا حادثہ بھی سنایا۔ ابراہیم
کی بلند ہمتی اور انسان دوستی کا ذکر کیا اور آخر میں ثمینہ کو اپنی بہو بنانے کی
خواہش کا ذکر کیا۔ طیب آخر خانم کی گود میں پلا ہے۔ ابراہیم کا بیٹا ہے
اس نے ماں کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا"

شعیب حیرانی سے ہری چاچا کو سن رہے تھے۔

"خانم نے مجھے وہ خط بتایا تھا جو اس نے امجد کو بھیجا تھا۔ امجد کا
اس شادی کے لئے راضی ہونا ضروری تھا۔ اس کی بیٹی بدنام ہو چکی تھی۔ اور

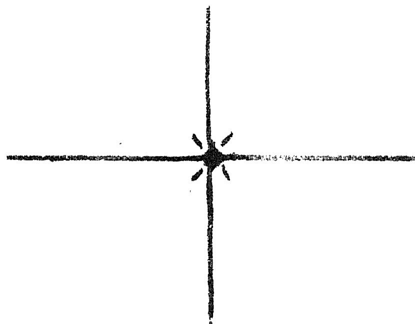
طیبہ — کیا کمی ہے طیب میں — وہ ابراہیم کی طرح اعلیٰ کردار کا مالک ہے۔ گریجویٹ ہے — Baby Care Centre کا کاروبار سنبھالتا ہے — تمہیں یہ سنکر اور بھی حیرانی ہو گی کہ خانم نے اپنے خط میں ایک شرط رکھی تھی کہ طیب کی شادی سے پہلے رعنا کی ابراہیم کی شادی خواہش کے مطابق شہزادے سے انجام پائے —"

اس آخری جملے نے شعیب کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑا دی۔ اس نے سر اٹھا کر میری چاچا اور شوبھا چاچی کو دیکھا جو اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شعیب نے سر جھکا لیا اور رک رک کر کہا۔

"میری چاچا مجھے میری ماں کے پاس لے چلیئے جس کی انگلی پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا ہے۔ ان کے حقوق کا اعتراف کرنا ہی حق شناسی کا تقاضہ

# زندہ قانون

اگر قصور ہے میرا تو بس یہی کہ تمہیں
کھلی کتاب کی مانند پڑھ لیا میں نے



گوکل نگر کے میدان میں ہر سال یادو میلہ بڑی دھوم سے منایا جاتا۔ اس دن میدان سے شہر کو جانے والی سڑک کے دونوں جانب ڈیروں کی شکل میں مٹھائی اور کھلونوں کی دوکانیں باڑ باندھ لیتیں۔ ان دوکانوں پر زیادہ تر شور مچاتے بچوں کی جمعیت ہوتی گرم گرم کڑاہیوں سے اٹھتی پوری کچوری بھینی مرچ اور سموسوں کی خوشبو سے رال ٹپکی پڑتی۔ کھلے میدان میں ایک طرف مداری اور شعبدہ باز بچوں اور بڑوں کو لطف اندوز کرتے تو دوسری طرف جھولوں ہنڈولوں پر چکر لگاتے۔ بچوں کی کلکاریوں سے ماحول جھنجھنا اٹھتا۔ اس دن یادو قبیلے کی عورتیں مانگ میں سیندور رچائے قیمتی ساڑیوں کے زرین پلو سے اپنا سینہ سجائے سج دھج کر گھر سے نکلتیں۔ ان کے مرد اور بچے سر پر رنگی برنگی چھجے دار شملے باندھے میلے میں شریک ہوتے۔ ان کے ساتھ ان کے سجے سجائے بیل ہوتے۔ اس دن ان بیلوں کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہوتا۔ انھیں خوب نہلایا دھلایا جاتا۔ ان کی سینگوں کو رنگا جاتا۔ ان کے جسموں پر رنگین نقوش بنائے جاتے۔ ان پر زرین گوٹے کی خوشنما چادریں اڑھائی جاتیں۔ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے۔ گویا وہ میلے کے دولھا ہوتے اور ان کے مالک براتی۔ ان مالکوں کے پرکھوں نے کرشن کنھیا کو اپنی محبت سے نہارا تھا تبھی

نھیں اسطرح خوشیاں مناتا دیکھ کر بڑے دوکانداروں کو یشودھا میّا کے لال
نا یاد آجاتی اور وہ انھیں دل کھول کر چندہ دیتے۔

بڑی رات گئے ان بیلوں کی لڑائی کا تماشہ ہوتا جن پر نشے کی مستی
چھائی رہتی ان کے آگے کان پھاڑنے والی آواز میں دھڑا بجایا جاتا۔ دھڑ دھڑ کی
دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ کی دھڑ کا شور اس ہنگامے سے کم نہ ہوتا جو اس میلے کا حصہ
ہوتا۔

یادو میلے کے دن گوکل نگر سے آگے بسیں چلنی بند ہو جاتیں۔ میدان
کے پچھلے حصے کی بستیاں شہر سے کٹ کر رہ جاتیں۔ سارا گوکل نگر گھروں پر تالا لگائے
میلے میں موج منانے آجاتا۔ ایسا ہی ایک یادو میلہ تھا جس دن کالج سے واپسی پر
نازیہ کا آٹو رکشا گوکل نگر سے بہت پہلے روک دیا گیا۔ میلہ وقت سے پہلے شروع
ہو گیا تھا۔ نازیہ کا گھر میدان کی دوسری جانب واقع تھا۔ وہ آٹو سے اتر پڑی اب
اس کو پیدل ہی گھر پہنچنا تھا۔ کالج میں ہونے والے ڈرامے کی تیاری میں اتنی مصروف رہی
کہ میلے کی بات ذہن سے اتر گئی ورنہ وہ گھر پہنچنے کے لئے دوسرا پیچیدہ لمبا راستہ
اختیار کر لیتی جو بستی کے پچھلے حصے کو جاتا تھا۔

نازیہ تھکن سے چور تھی وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے میلے کے
قریب پہنچی۔ اس کے چہرے پر آئی کڑواہٹ کو میلے کے چہل پہل نے دور کر دی۔
وہ میلے کی رنگ رلیوں سے محظوظ ہوتی اس کی چکا چوند روشنی میں نہاتی، لوگوں
کو ریلتی میدان پار کر گئی۔ اب میلے کا شور کم ہوتا جا رہا تھا اور سناٹا شام
کے ہلکے دھندلکے کی آغوش میں سما رہا تھا۔ نازیہ ایک موڑ پہ پہنچ کر

رک گئی - سامنے زلفِ سیاہ فام کی طرح بل کھاتی چکنی سڑک دور تک پھیلتی چلی گئی تھی جس کے کناروں کو ٹیلیفون کے محکمے والوں نے ادبڑ کھابڑ زمین میں تبدیل کر دیا تھا - دوسرا راستہ مانگ کی طرح سیدھا تھا اور آگے جا کر ایک پلے گراؤنڈ سے ملتا تھا - پلے گراؤنڈ سے ذرا پرے ایک اور سڑک شروع ہوتی تھی - یہ دونوں راستے نازیہ کے گھر سے جا ملتے تھے -

پلے گراؤنڈ پر ہمیشہ کھلاڑیوں کا قبضہ اور تماشائیوں کا ہجوم رہتا - آج وہاں بھی سناٹا پھیلا ہوا تھا - نازیہ نے گھر جانے کے لئے اسی قریب کے راستے کو اپنایا - میلے میں پھیلی مسرت کی ایک لہر اب بھی نازیہ کے ساتھ چل رہی تھی - وہ گنگناتی آگے بڑھتی رہی - کچھ دور چلنے پر اُسے دور کی پہاڑی پر کھڑا ایک گرجا گھر نظر آیا - جس پر لگے صلیب کو دیکھتے ہی نازیہ کی ساری شوخی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی - اُسے فلپائن میں ہونے والا صلیبی واقعہ یاد آ گیا - نازیہ نے پڑھا تھا کہ فلپائن میں ہر سال گڈ فرائی ڈے پر صلیبی واقعہ دہرایا جاتا ہے - صلیبی جگہ پر بہت بڑا میلہ ہوتا ہے - اُس دن فلپائن کے ایک شہر سے جلوس نکالا جاتا ہے - صلیبی واقعے کو دہرانے والے اس جلوس میں وزنی صلیبیں اٹھائے چلتے ہیں - اس سال بھی گیارہ آدمیوں کے ہاتھوں میں لوہے کی کیلیں ٹھونکی گئیں پھر یہ لوگ پانچ منٹ تک صلیب پر لٹکے رہے -

نازیہ کی سوچ کے دھارے بہہ نکلے اس نے دل میں کہا "کیا ہی اچھا ہوتا یہ وزنی صلیبیں اٹھائے جلوس میں چلنے والے گیارہ آدمی صبر و تحمل اور ضبطِ نفس کی صلیب اٹھا لیتے اور عقیدت کے جلوس میں یسوع مسیح کے

---

(۹) نے صلیبی واقعہ کو دہرایا تھا - ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے گناہ بخشوانے کے لیے صلیبیں اٹھاتے ہیں - جب ان کا جلوس صلیبی جگہ پہنچا تو صلیبیں [illegible]

نلئے ہوئے غور و فکر کے راستے پر چل پڑتے جو برائیوں کے دھندلکوں کو چھانٹتا ہے اور بصیرت کے آئینے کو چمکاتا ہے۔ پھر زمانہ انھیں تکلیفوں اور مصیبتوں کی صلیب پر چڑھا بھی دیتا تو کامرانی کا حقیقی سکون انھیں حاصل ہو جاتا۔"

ان ہی خیالوں میں منہمک نازیہ نے پلے گراؤنڈ کا کچھ راستہ پار کر لیا۔ اس کی نظر کنارے پر دھرے سمنٹ کے بنچوں پر پہنچ کر رک گئی جہاں سے چار حیران نگاہیں اُسے گھور رہی تھیں۔ خوف نے نازیہ کے قدم پکڑ لئے۔ سناٹے کا ڈر اس کے سراپے میں گھس کر اس کو کپکپانے لگا۔ اس نے دل میں کہا۔

"ہائے اللہ یہ تو وہی بدمعاش ہیں جو مجھے بس میں چھیڑا کرتے تھے۔"

نازیہ نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی وہاں تنہائی کا بھوت پیر پھیلائے بیٹھا تھا ــــــ

جن دنوں نازیہ کالج کو بس میں جایا کرتی تھی یہ دونوں لڑکے قادر و وجیے اسی بس میں سوار اپنے کالج کو جایا کرتے۔ بس میں وہ ہمیشہ نازیہ کو چھیڑا کرتے کبھی عشقیہ فلمی مکالمے دہراتے تو کبھی دھیمے سروں میں گانا گاتے۔ قریب کھڑی دوسری لڑکیاں ان کی اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو کر ایک دوسرے کی گردن میں منہ چھپائے مسلسل ہنستی رہتیں۔ گویا لڑکوں کی شکل میں انھوں نے زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہو۔ نازیہ کی سوجھ بوجھ ان لڑکیوں سے الگ تھی۔ وہ اس چھیڑ چھاڑ پر اپنے کان بند رکھتی اور بے حس بنی خاموش کھڑی رہتی۔ اسی لئے ان لڑکوں نے اس کا نام "پتھر کی مورتی" رکھا تھا۔

ویسے نازیہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں جادو جگاتی تھیں

قدرت نے اس کی آنکھوں میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ اس کی چمکتی آنکھیں
سانولا رنگ نکلتا قد اور متناسب بدن اس کو جاذب نظر بنائے ہوئے تھے۔
نوجوانوں کی شوخی جب کچھ اور بڑھ جاتی تو وہ بس کنڈکٹر کو بھی نہیں بخشتے وہ
جب قریب سے گذرتا تو اس پر جملے کستے وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ بس
کنڈکٹر کے غیر ذمہ دارانہ رویئے اور مسافروں کی بے حسی نے ان لڑکوں کی جرأت
کو بڑھا دیا۔ ایک دن وہ اسی طرح چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے کہ بس ڈرائیور نے
یکایک بریک لگایا۔ کوئی رکشہ راں سامنے آگیا تھا۔ بس خطرناک جھٹکے کے ساتھ
رک گئی۔ بس میں بیٹھے سارے مسافر آگے کی جانب جھول گئے۔ اس سے فائدہ
اٹھا کر نازیہ کے پیچھے کھڑا قادر عمداً اس پر آگرا۔ نازیہ اپنا توازن کھو بیٹھی
اور سامنے بیٹھی عورت پر گر پڑی۔ اس عورت نے درد سے بے چین ہو کر اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر نازیہ کو بُرا
بھلا سُنانے لگی۔ اس سے لطف اندوز ہو کر قادر اور شبّے قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔
نازیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہتک کے طمانچے نے اس کا منہ لال
کر دیا تھا۔ پتھر کی مورتی غیض و غضب کی مورتی بن گئی۔ اس نے تانت
کھینچ لئے اور ایک زوردار طمانچہ قادر کے گال پر رسید کیا۔ قادر بوکھلا گیا۔
مسافر چونک پڑے۔ جیسے چابک نے ان کی بے حسی پر تازیانہ لگایا ہو۔ لڑکی
کو غضبناک دیکھا تو مسافروں کے منہ میں زبان آگئی ——— لڑکوں کی لے دے
شروع ہوئی۔ اس غل غپاڑے میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دینے
لگی۔ نازیہ کو اس ہنگامے نے ڈرا دیا۔ وہ مجرم بنی آگے کی جانب کھسک گئی
پھر جیسے ہی کالج کا بس اسٹاپ آیا اتر پڑی۔ اس واقعے کے بعد نازیہ

نے کالج کو بس میں جانا چھوڑ دیا لیکن وہ ڈراؤنا واقعہ اس کے تحت الشعور میں چھپا بیٹھا رہا۔ آج وہ سر نکالے اسے ڈرا رہا تھا۔

قادر اور دبجے بھی ایک عرصے کے بعد نازیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے لیکن ان کی حیرانی کے پاؤں ٹکے نہیں۔ قادر کے ہونٹوں پر بھی مکروہ مسکراہٹ دیکھ کر نازیہ کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔ اس نے پورا زور لگایا اور پلٹ کر وہاں سے بھاگ کھڑی۔ لیکن وہ زیادہ دور بھاگ نہ پائی کیونکہ قادر لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آ پہنچا اور باز کی طرح جھپٹا مار کر اس کی ساڑی کا پلو پکڑ لیا۔

نازیہ سہم گئی اور مدد کے لئے چیخنے لگی —— اس کی ہر چیخ ہر پکار —— اطراف کے بند تالوں سے ٹکرا کر فضا میں بکھر گئی۔ قادر نے دانت پیسے۔

"اب میں اس دن کے چانٹے کا ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رہے گا"۔

یہ سن کر نازیہ لرز گئی۔ تنہائی اور بے بسی سے مجبور ہو کر وہ عاجزی کرنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو —— مجھے چھوڑ دو"

لیکن اس کی ہر منت پر قادر قہقہوں کا ہنٹر لگاتا رہا۔ ساڑی کھینچتا رہا آگے بڑھتا رہا —— نازیہ کانپتی رہی۔ پرت پرت کھلتی رہی اور پیچھے ہٹتی رہی۔ پھر قادر نے زور کا جھٹکا لگایا اور اس جھٹکے نے پردہ داری کا بھرم گنوا دیا۔

نازیہ پر سکتا چھا گیا۔ وہ بت بنی کھڑی رہی جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اسی بے خبری کے عالم میں چند ساعتیں گذری تھیں کہ قادر کی نظروں کی ڈنک نے نازیہ کے بدن میں انگارے بکھیر دیئے۔ وہ تلملا اٹھی۔ ہوش نے اُس کے پھولے پاؤں میں سکت پیدا کی ——— وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ لیکن اس حالت میں جاتی کہاں ——— آخر سمنٹ کے بنچوں کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا۔ خوف کے صدمے سے نازیہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ گرم آنسو تھمے رہے اور آنکھیں اندھا آئینہ بنی رہیں۔ پھر پاؤں کا کھٹکا اور گرم سانسوں کی بھبک پر وہ چونک پڑی اور گرم اشک پونچھ ڈالے۔ دیکھا سامنے قادر کھڑا ہے۔ مارے خوف کے وہ چیخ پڑی اور "یا خدا" کی کلیجہ چیرتی ہوئی چیخ، فریاد کا تیر بنکر آسمان سے جا ٹکرائی اور وہاں سے ایک تارہ توڑ لائی۔

ڈیزل انجن کی گھڑگھڑاہٹ ماحول پر چھا گئی۔ پچھلے حصّے کی بستی سے ایک سفید ایمبیڈر کار نکلی اور دیگتی شور مچاتی ان کے قریب آکر ٹھہر گئی۔ اس کار کی اسٹیرنگ پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا جو بہت مہذب لگ رہا تھا۔

آنے والے نے کار میں بیٹھے وہاں کا جائزہ لیا۔ دیکھا ایک لڑکا ساڑی ہاتھ میں لپیٹے کھڑا ہے۔ دوسرا منہ اوپر کو اٹھائے اُسے گھور رہا ہے۔ سمنٹ کے بنچوں سے خوف میں ڈوبی دو آنکھیں ایک التجا لئے اُسے گھور رہی ہیں۔ لڑکی کی بے بسی نے اجنبی کو معاملہ کی تہہ تک پہونچا دیا۔

انجن کا شور بند ہوا۔ اجنبی کار سے اتر پڑا۔ اور نگاہوں میں قہر کی

کھٹائیں لئے ان نوجوانوں کو گھورنے لگا جو اُسے بے شعور سڑک چھاپ فرہاد نظر آئے۔
وہ قادر کے مقابل کھڑا ہوا اور گونجتی آواز میں کہا۔
"شرم نہیں آتی۔ساڑی ہاتھ پر لپیٹے دشاسن بنے کھڑے ہو"
"خیریت چاہتے ہو تو چلتے پھرتے نظر آؤ" قادر کی بجائے وجے نے
جواب دیا جو عام استعمال کا ایک چھوٹا چاقو ہاتھ میں لئے گھما رہا تھا۔
"ورنہ کیا کرو گے؟" اجنبی نے چاقو کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں" وجے نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔
اجنبی پھر قادر سے مخاطب ہوا اور دھمکی کے انداز میں کہا۔
"دیکھو — لڑکی کو ساڑی دے دو۔ ورنہ مجھے بھی دوسرا طریقہ استعمال
کرنا پڑے گا"
جواب میں وجے اجنبی پر پل پڑا۔ گو اجنبی عمر میں وجے سے بڑا تھا اور
سرتی جسم کا مالک تھا لیکن وہ چاقو کی دھار سے واقف نہ تھا۔ چھینا جھپٹی میں
چاقو اجنبی کے ہاتھ کو گھائل کرتا زمین پر گر پڑا۔ اجنبی کے منہ سے کراہ نکلی۔ وجے
گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ خون کے قطرے زمین پر گرنے لگے۔ خون ناحق کو کھردری زمین
اپنے سینے میں جذب کرتی چلی گئی۔ زخمی ہاتھ تھامے اجنبی نے ایک نظر اس لڑکی پر
ڈالی جس کی مظلوم نگاہیں اب بھی فریاد کر رہی تھیں جس کے کپکپاتے ہونٹوں پر الفاظ
دم توڑ رہے تھے۔ جس کا ایک ایک رونگٹا اجنبی کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔
لڑکی کی بے چارگی نے اجنبی کو انسانیت کے گہراؤ میں اتار ڈالا۔ چاقو اس
کے قریب اور نوجوانوں سے دور زمین پر پڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں نوجوانوں کی

جانب پھیریں ــــ لڑکے تھوک نگل رہے تھے۔ ان کا کس بل ختم ہو چکا تھا۔
ڈر کی مکڑی اُن کی آنکھوں میں جالا بُن رہی تھی۔

اجنبی نے جیب سے دستی نکالی اور زخم پر لپیٹا۔ چاقو کو زور سے ٹھوکر لگائی اور خود سے دور کر دیا۔ نوجوانوں سے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تم دونوں کی طرح بے وقوف نہیں ہوں کہ ہنسا سے کام لوں۔ لیکن تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تم نے ہماری پرمپرا کی لکشمن ریکھا کو پار کیا ہے ہمارے دیش میں عورت کی عزت ہوتی ہے۔ دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ ہمارا کام استری کی عزت کی رکھشا کرنا ہے اس کو ننگا کرنا نہیں"

قادر نے غصے سے جواب دیا "آپ نہیں جانتے اس لڑکی نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اس نے ہماری بے عزتی کی تھی۔ میرے منہ پر طمانچہ لگایا تھا۔"

اجنبی سمجھ گیا کہ بدلے کی بھاونا نے لڑکوں کو آپے سے باہر کر دیا ہے۔ انتقام کی آگ نے تہذیبی حد بندیوں کو جلا کر دھواں کر دیا ہے۔ اب اسے لڑکوں کا خوف نہیں تھا۔ وہ اپنا ہاتھ تھامے ان کے قریب پہنچا اور نرمی سے کہنے لگا۔

"دیکھو میرا نام موہن داس ہے۔ بیٹا عمر میں تم دونوں سے بڑا ہوں اسی لئے تمہیں سمجھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ تم دونوں پڑھے لکھے نظر آتے ہو لیکن اتنا نہیں جانتے کہ تمہاری اس حرکت سے ایک سمسیا کھڑی ہو سکتی ہے پہلے ہی دیش دروہیوں نے ہمارے چپے چپے کو شمشان بنا رکھا ہے۔ ایسے میں کیا تم ایک اور شمشان بنانا چاہتے ہو؟"

یہ سن کر لڑکے آگ سے پانی ہو گئے۔ موہن داس نے اندازہ

لگا یا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے صحیح ضرب لگانے سے اخلاق کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے انھوں نے کہنا شروع کیا۔

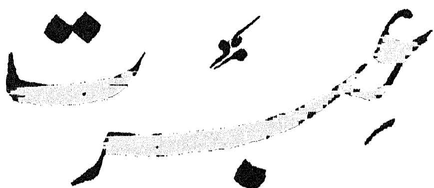
"شہر میں میری کپڑے کی دوکان ہے۔ ہر روز میرے ملازم شیشے کی کیس میں کھڑی بے جان پتلیوں کی ساڑیاں بدلتے ہیں لیکن اس وقت وہ شیشے پر پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ راہ چلتے راہ گیر ان بے جان پتلیوں کو ننگا نہ دیکھ لیں"۔

موہن داس یہ کہتے کہتے رک گئے کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ "نادر" کے ہاتھ پر ساڑی کے بل کھلتے جا رہے ہیں۔ جہالت کے اندھیرے میں ٹھوکر کھانے والے نے نصیحت کی روشنی میں آنکھیں کھول دی ہیں۔ نفرت و انتقام کے جذبات، ندامت کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ہیں۔

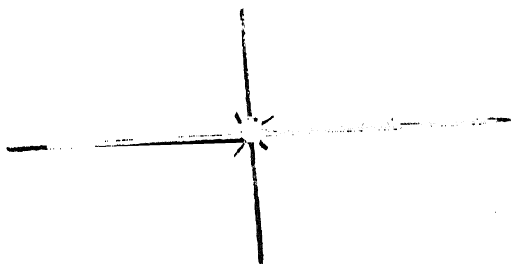
ساڑی گول گیا ہو کر نازیہ کے قدموں میں آ گری۔ اُس نے ساڑی کو جھپٹ لیا اور تیزی سے باندھنا شروع کیا۔

انجن کی گھڑ گھڑاہٹ پھر ایک بار ماحول پر چھائی نازیہ چونک پڑی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا کہ لڑکے اندھیرے کی چادر سے باہر نکل رہے ہیں۔ سفید کار شور مچاتی پچھلے حصے کی بستی میں گم ہو رہی ہے۔ نازیہ اپنا دل مسوس کر رہ گئی کہ وہ اس اجنبی کا شکریہ بھی ادا نہ کر پائی جس کا وہاں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ نصرت و حمایت کا زندہ قانون تھا۔

■ ■




وہ شرافت وہ صداقت وہ محبت وہ خلوص
آپ کے دور کا کردار گیا آپ کے ساتھ



وہ رات سراسر سلامتی کی رات تھی۔ رحمت کی رات تھی جس کی برکت طلوعِ فجر تک برقرار تھی۔ گاؤں کی مساجد میں صفائی ہو چکی تھی۔ برقی قمقموں سے مساجد اور راستے منور کیے گئے تھے۔ مساجد کے حوضوں کا صاف شفاف پانی عبادت گذاروں کے چہروں کو مس کرنے مچل رہا تھا۔ ذکرِ الٰہی دل و دماغ کو عظمتِ الٰہی کے تصور سے روشن کر دیتا ہے۔ اطراف واکناف کے لوگ سمٹ کر عبادت کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ سہیل بھی اس رات کے متبرک لمحات کو عبادت اور اطاعت میں صرف کرنے گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو شہر سے آ رہا تھا۔

سہیل نے پوچھا۔

"کہو بھائی۔ شہر کے کیا حالات ہیں؟"

"میں آپ ہی کے پاس آ رہا تھا سہیل بھائی۔ آپ کے لئے بری خبر ہے آج زینو چاچا کا انتقال ہو گیا"۔

"انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھ کر سہیل خاموش ہو گئے پھر کہا۔

"جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا ہے جو کھلتا ہے وہ مرجھاتا ہے۔ یہ برحق ہے لیکن خدا غریقِ رحمت کرے ہمارے زینو چاچا کو۔ بڑی خوبیوں کے مالک

تھے وہ"

یہ کہہ کر سہیل رنجیدہ مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ تمام رات عبادت میں گزاری اور زینو چاچا کی مغفرت کی دعا بھی کی۔ جب عبادت ختم کی تو گھر پہونچے۔ سیدھا مطالعہ کے کمرے کا رخ کیا۔ خود کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن نیند کا کہیں پتہ نہ تھا شاید وہ بھی زینو چاچا کا دیدار کرنے شہر چلی گئی تھی۔

بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک تھے زینو چاچا۔ گاؤں کے بڑے زمینداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لیکن زراعت سے ان کی دلچسپی اس حد تک تھی کہ وہ ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔ انھوں نے گھر پر ہی تعلیم پائی تھی۔ انھیں عربی فارسی اور اردو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جہاں کسی کا شین قاف درست نہ پاتے فوراً ٹوک دیتے۔ شرعی مسائل کا حل ان کے نوکِ زبان ہوتا۔ شکار کے شوقین تھے۔ شکار کی تلاش میں گاؤں سے دور گھنے جنگلوں میں بے خوف و خطر گھس پڑتے۔ کبھی اپنی جیپ میں چیتا مار لاتے تو کبھی ہرن۔ کچھ نہ ملتا تو کالی ہی مار لاتے۔ ایک بار انھوں نے شیر کا شکار بھی کیا تھا۔ ان کے شہ نشین کی دیواریں ان شکاری جانوروں کے سروں سے سجی ہوئی تھیں۔ گاؤں والوں کے ہمدرد تھے۔ ان کے خوشی و غم میں ہمیشہ شریک رہتے۔

ان کا پورا نام سید زین العابدین تھا لیکن گاؤں کے چھوٹے بڑے انھیں زینو صاحب کہہ کر پکارتے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ہر طرف افراتفری پھیلی تو زینو چاچا کا گاؤں بھی حوادث سے بچ نہ پایا۔ لوٹ مار کے ساتھ جب گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت کا جنازہ نکلتا دیکھا تو اس خطرے سے اپنی بیوی اور بیٹی کو بچا نکالنے کے لئے خود ہی گاؤں نکالے ہو گئے۔۔۔ لہلہاتے کھیت ۔۔۔ پانی سے ابلتی باؤلیاں۔۔۔

ز بیلیں ــــ سب کچھ اونے پونے بیچ دیا۔ اور "جان ہے تو جہان ہے" کہتے
ئے شہر میں سکونت اختیار کر لی۔

شہر میں وہ ابھی سانس [illegible] نہ پائے تھے کہ گاؤں سے لایا ہوا اثاثہ
م ہو گیا۔ زینو چاچا [illegible] کو گھر میں قدم رکھتے دیکھا اور مقابلے کے لئے
ٹ گئے [illegible] چھوٹی آ [illegible] کھا۔ اور اجلی گزران کے لئے اپنے ایک
یز کے بیوپار میں جٹ گئے ان کے پاس کوئی ڈگری تو تھی نہیں ہاں قابلیت
ور تھی جس کے بل بوتے پر انھیں کام ملنا مشکل تھا۔

غرض زینو چاچا کو اس دھندے میں کبھی سامان سے بھری لاری شہر
ے باہر لے جانا پڑتا اور کبھی شہر میں لانا پڑتا۔ جن لوگوں نے زینو چاچا کے اچھے دن دیکھے
ے وہ انھیں لاری چلاتا دیکھتے تو انگشت بدنداں ہوتے لیکن زندگی کے جوار بھاٹے کا
ا اثر زینو چاچا پر نہیں ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ کوئی کام چھوٹا یا بڑا اچھا یا برا
ہیں ہوتا۔ برا تو وہ شخص ہوتا ہے جو بھوکے کو کھلا نہیں سکتا اور ننگے کا تن ڈھانک
ہیں سکتا۔ صرف اپنی انگلیاں دوسروں پر اٹھائے رکھتا ہے۔

بیوپار میں نفع نقصان کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ زینو چاچا کے
یز نے بھی کچھ مدت تک خوب نفع کمایا۔ پھر ان کا بیوپار آڑے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس
ھندے میں زینو چاچا نے خوب محنت کی تھی لیکن انھیں اپنے نقصان سے زیادہ
ن عزیز کے نقصان کا رنج تھا جو ان کے آڑے وقت کام آیا تھا۔

اس اثنا میں زینو چاچا کی علمی قابلیت کی شہرت اڑتے اڑتے
ب خانگی شعبے تک پہنچ گئی۔ جہاں زبانوں کے ترجموں کا کام چل رہا تھا۔

اس بار معاش خود ان کی تلاش میں ان کے گھر آئی۔ گو آمدنی کم تھی۔ لیکن زینو چاچا کو یہ کام بہت بھایا۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں زینو چاچا بہت سخت تھے صرف مذہبی اور اسکول کی تعلیم ان کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ لیکن جب ان کی لڑکی عالیہ نے کالج جانے کی ضد کی تو خاموش ہو گئے۔ عالیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور بے جا لاڈ و پیار نے اسے ضدی بنا دیا تھا۔ ویسے زمانے کی دھوپ چھاؤں نے زینو چاچا کو سمجھا دیا تھا کہ وقت کے ساتھ نہ چلنے پر پاؤں آبلہ پا ہو جاتے ہیں۔ جب عالیہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئی تو وقت نے پھر ایک بار زینو چاچا کا امتحان لیا۔ عالیہ ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ اور زینو چاچا اس کے لئے راضی نہ تھے۔ عالیہ بضد ہو گئی۔ اس کا بضد ہونا شاید اس سختی کا ردِ عمل تھا جو تعلیم اور پردے کے بارے میں زینو چاچا کا رویہ تھا۔ آخر بیٹی کی ضد کے آگے انھیں جھکنا پڑا۔ زینو چاچا نے اپنے برے وقت کو یاد کیا، اور بیٹی کو ملازمت کی اجازت دے دی۔ اس طرح جب بھی زینو چاچا کے اصولوں کا لباس پھٹا انھوں نے دل کے بہلاوے سے اس کا رفو کر لیا۔

شہر کی زندگی اور ان کا رکھ رکھاؤ ہمیشہ زینو چاچا کے پاؤں آمدنی کی چادر سے باہر نکال دیتے۔ بچی کچی کسر عالیہ کی شادی نے پوری کر دی۔ قرضوں کا بوجھ زینو چاچا کی گردن توڑے دے رہا تھا انھیں اپنے وظیفے پر ہٹنے کے دن کا انتظار رہنے لگا۔ آخر وہ دن آ گیا۔ ان دنوں زینو چاچا کی بیوی بہت بیمار رہا کرتی تھی۔ کچھ پیسہ بیوی کی بیماری کے نذر ہوا وہ پھر بھی جانبر نہ ہو سکی اور ملکِ عدم

کی راہ لی۔

اب زینو چاچا تنہا تھے اور ان کی زندگی بے کیف۔ اپنی زندگی کی خلا کو پُر کرنے وہ بیٹی کے گھر چلے آئے۔ بچا کچا پیسہ نواسا نواسی کی محبت میں صرف کر دیا۔ دن گذرتے گئے۔ زینو چاچا کبھی کسی نواسے کو اسکول چھوڑ آتے کبھی کسی کو ڈاکٹر کے پاس لے پہنچتے۔ کبھی انھوں نے اپنا وقت پھولوں کے درخت لگانے میں صرف کیا تو کبھی لان پر ہریالی بچھانے میں۔

بیٹی کی شادی میں زینو چاچا زیادہ جہیز نہیں دے پائے تھے بس اپنی گڑیا سنوار دی تھی۔ اس لئے عالیہ جب دفتر کا زینہ زینہ چڑھنے لگی تو کبھی برف کی الماری خرید لائی کبھی ڈائننگ ٹیبل کرسیاں کبھی صوفہ سیٹ اور الماریاں کبھی زیور اور سجاوٹ کی چیزیں۔ اس طرح اشیائے مایحتاج مہیا کرتے ہوئے وہ جھوٹے وقار اور تصنع کا بھی شکار ہوتی رہی۔

بچے شہر کے مشہور اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ ان سارے اخراجات کا ہجوم عالیہ کو الجھائے رکھتا۔ زینو چاچا دیکھ رہے تھے کہ سابقتی دوڑ نے عالیہ کی سانس پھلا دی ہے لیکن اب وہ ایک مجبور انسان تھے۔ بیٹی پر بوجھ بنے ہوئے تھے۔ اونچی آواز میں بات کرنے سے گریز کرتے۔ پھر بھی جب برداشت نہ کر پائے تو دبی آواز میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور بیٹی کو اس کے رویئے پر ٹوک دیا۔ ہوا وہی جس کا انھیں ڈر تھا۔ عالیہ ان سے اُلجھ پڑی۔

"آپ ہی کی وجہ سے ہم نے مفلسی کی زندگی کاٹی ہے۔ نہ گاؤں کی

جائیداد کوڑیوں کے مول بیچتے نہ وقت ہم پر سخت گذرتا۔ اب جبکہ میں اپنا پوزیشن بنا رہی ہوں آپ کو اعتراض ہو رہا ہے"

زینو چاچا بیٹی کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ عالیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ انھوں نے کن حالات میں گاؤں چھوڑا تھا۔ لیکن وہ کسی سے کیا کہتے؟ داماد بھی ان کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو وہی کہتے جو ان کی بیوی عالیہ کہتی۔ اب عالیہ ہر روز زینو چاچا کو کچھ نہ کچھ سنانے لگی۔

"آپ چائے بہت پیتے ہیں۔ صحت کے لئے ٹھیک نہیں کم کیجئے"۔

"سگریٹ کے بہت نقصانات ہیں سگریٹ پینا بند کیوں نہیں کرتے؟

"یہ آپ سیکل پر تمام دن کہاں پھرتے رہتے ہیں۔ خواہ مخواہ دوسروں کے پیچھے اپنا وقت برباد کر رہے ہیں"

"بچوں سے زیادہ لاڈ و پیار مت کیجئے وہ بگڑ رہے ہیں"

زینو چاچا اپنی بیٹی کا حشر دیکھ چکے تھے اسی لئے وہ نواسا نواسی سے بے جا لاڈ پیار نہیں کرتے۔ لیکن زینو چاچا کو اس بات کا احساس تھا کہ ماں باپ میں تاجرانہ ذہنیت پیدا ہو جائے تو ان کے معصوم بچوں پر ناخوشگوار نفسیاتی ردعمل ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسا ماحول پیدا کر رہے تھے کہ بچوں میں والہانہ محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ بیٹی کی کڑوی باتوں کو زینو چاچا نظر انداز کرتے رہے یہی سمجھتے رہے کہ عالیہ کا بچپن معاشی بحران سے گزرا ہے۔ اسی لئے محتاط زندگی جینے کے حق میں ہے لیکن جب بات آگے بڑھتی رہی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ سننے کو ملنے لگا تو وہ چونک پڑے۔ اور سوچنے لگے۔

"عالیہ نے یہ کیسا وطیرہ بنالیا ہے۔ بیٹیاں تو ایسی نہیں ہوتیں۔

وہ تو بہت پیاری ہوتی ہیں" لیکن وہ کہتے تو کس سے کہتے ـــــ ہونٹ بھی اپنے دانت بھی اپنے ـــــ آخر زینو چاچا کو اپنی ناعاقبت اندیشی کا افسوس ہونے لگا۔ انھوں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈنی چاہی ـــــ مایوسی اور قنوطیت ان پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کتاب ہاتھ میں رہتی الفاظ ہوا میں اُڑ جاتے مضمون بے معنی ہو جاتا۔

ان حالات میں انھیں اپنے بھتیجے سہیل کی یاد آئی جو ان کے آبائی گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ زینو چاچا کے ہم ذوق و ہم خیال تھے۔ زینو چاچا نے جب گاؤں چھوڑا تو پھر وہاں قدم نہیں رکھا۔ اس لئے سوچا چلو گاؤں بھی دیکھ آئیں اور سہیل سے بھی مل آئیں۔

سہیل انھیں ہاتھوں ہاتھ گھر لے گئے۔ سہیل کی بیوی جو ایک نیک خاتون تھیں۔ ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ وہ دونوں زینو چاچا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن علی الصبح سہیل اپنے کھیتوں کی نگرانی کے لئے نکلے تو زینو چاچا بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ تمام راستہ ان کے درمیان زراعت کی گفتگو ہوتی رہی۔ سہیل خوش تھے کہ زینو چاچا کے نہاں خانۂ دل میں اب بھی زراعت کا شوق باقی ہے۔ سہیل ان کے معلومات میں اضافہ کرتے رہے کہنے لگے۔

" زینو چاچا جب گاؤں میں سبز انقلاب آیا تو اس سے ہماری زراعت میں نئے سنگ میل قائم ہوئے زیادہ پیداوار دینے والے بیج تیار ہوئے۔ آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ ہوا۔ اور کیمیائی کھاد جراثیم کش ادویہ کا

بڑے پیمانے پر استعمال ہوا"

"پھر تو پیداوار بلند سطح پر پہنچ گئی ہوگی" زینو چاچا نے پوچھا۔

"جی ہاں! وہی تو عرض کر رہا ہوں کہ پیداوار میں کافی اضافہ ہو گیا ہے"۔

زینو چاچا زراعت کے میدان میں اپنے بھتیجے کی دلچسپی سے بہت خوش ہوئے۔ اس طرح سہیل کے ساتھ دن کا زیادہ وقت کھیتوں پر گزارا۔ دوپہر گھر لوٹ آئے۔ سہیل نے بتایا کہ اب بھی گاؤں کے بزرگ شام ہوتے ہی درگاہ پر جمع ہوتے ہیں۔ زینو چاچا کو اپنی ماضی کے خوشگوار لمحات یاد آگئے وہ بیتابانہ شام ہوتے ہی درگاہ پہنچے۔ گاؤں والوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔ پھر ان کے درمیان گفتگو کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ کبھی دینی مسائل پر بحث ہوئی تو کبھی سماج کی ہمہ جہت ترقی پر۔ کبھی دنیا میں پھیلی بے چینی پر تو کبھی خانگی جھگڑوں پر ـــــ درمیان میں چلنے والا چائے کی گلاسوں کا چھینکا لئے پہنچ گیا۔ چائے نوشی ہوئی۔ سگریٹ جلائے گئے - وہاں زینو چاچا کو نہ کوئی روکنے والا تھا اور نہ ٹوکنے والا۔

اب زینو چاچا کا یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ کھیتوں پر صبح چلے جاتے اور گاؤں کی درگاہ پر شام گذارتے۔ وہ خوش تھے کہ آج تک بھی گاؤں والوں میں وسیع القلبی رواداری اور خلوص کے عنصر قائم ہیں۔ اس طرح زینو چاچا نے کچھ عرصہ گاؤں میں بتایا۔ پھر وہی شہر ـــــ وہی تصنع ـــــ وہی گھٹا گھٹا ماحول ـــــ

عالیہ زینو چاچا سے ناراض تھی ـــــ غیر اہم باتوں کو اپنی شخصیت کا مسئلہ بنا لینا اس کی طبیعت میں داخل ہو گیا تھا کہنے لگیں۔

"گاؤں میں اتنا عرصہ بتا دیا آپ نے۔ کبھی سوچا لوگ کیا کہیں گے

رے بارے میں"

"تم لوگوں سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ میں گاؤں میں سہیل کے پاس ٹھہرا

تھا وہ میرا بھتیجا ہے۔"

"ہوں! آپ کا بھتیجا! وہ تو ہمارے وقار سے جلتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو عالیہ؟ سہیل اور اس کی بیوی ایسے نہیں ہیں"

"آپ نہ ان دونوں کو سمجھ پائے اور نہ ہمارے معاشرے کو۔ آپ

ے لوگوں کو موقع دیا ہے کہ سہیل بھائی تعریف کریں اور میری مذمت۔"

یہ سن کر زینو چاچا حیران رہ گئے کہ زندگی کی جن اعلیٰ قدروں سے

ہ عالیہ کو روشناس کراتے رہے ان کا زرتار لباس اس نے کب اتار پھینکا۔

ر جھوٹی انا اور احساس برتری کا چغہ اسے کس نے پہنایا؟ اس کے لئے وہ عالیہ

کے دوستوں کو دوشی ٹھہراتے۔ ان کا خیال تھا کہ جھوٹی انا اور خودغرضی کی ڈگر پر

چلنا عالیہ نے اپنے دوستوں سے سیکھا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود زینو چاچا جب بھی گھر کے گھٹے ماحول سے

گھبراتے تو پناہ لینے گاؤں پہنچ جاتے۔ گو وہ اس بات سے واقف تھے کہ ان کا

یہ عمل عالیہ کے دل میں سہیل اور ان کی بیوی کے لئے نفرت کا زہر بھر رہا ہے۔

پھر تو گھر کے نوکروں نے لنکا ڈھادی۔ تمام رشتے داروں میں چہ میگوئیاں

ہونے لگیں کہ عالیہ کا سلوک اپنے باپ سے ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے زینو چاچا

زیادہ وقت گاؤں میں گزارتے ہیں۔ ایسی باتوں کو پَر خود بخود لگ جاتے ہیں۔

اُڑتے اُڑتے یہ خبر عالیہ تک پہونچی یہ سن کر اس کے وقار کو ٹھیس لگی۔ وہ

ذلت اور شرمندگی محسوس کرنے لگی۔ اور پردہ داری کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

سہیل کی بہن اسی شہر میں رہتی تھی جس شہر میں عالیہ رہتی تھی وہ بھی عالیہ کے دفتر میں کام کیا کرتی تھی۔ عالیہ کی طبیعت سے خوب واقف تھی جب بھی عالیہ حدِ ادب سے باہر ہو جاتی وہ زینو چاچا کی محبت میں خاموش رہ جاتی۔ لیکن جب بات ناقابل برداشت ہوتی تو وہ اس کا خوب ہانکا لیا کرتی۔

ایک دن وہ اپنے بھائی سے ملنے گاؤں گئی۔ اس وقت زینو چاچا بھی وہاں موجود تھے اور نماز میں مشغول تھے۔ انھیں دیکھ کر سہیل کی بہن کہنے لگیں۔

"تعجب ہے یہ زینو چاچا کی لڑکی کتنی بدل گئی ہے۔ ہر وقت آپ سب کو نشانِ ملامت بناتی رہتی ہے۔ میں نے بھی اس کو خوب سنایا۔

"آخر کیا کہا تم نے؟" سہیل نے پوچھا۔

"یہی کہ زینو چاچا نے اسے کس سانچے میں ڈھالنا چاہا اور وہ کیا بن گئی ہے۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ گراوٹ کی باتوں سے اقدار کا سوتا خشک ہو جاتا دیکھئے۔ آپ بھی جانتے ہیں سہیل بھائی کہ دنیا کتنی آگے نکل گئی ہے۔ آج کی عورت زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ بچھندری پال نے ایورسٹ کی چوٹی سر کرلی۔ آرتی سہائے نے انگلش چینل تیر کر پار کرلیا۔ اور تو اور سرلا ٹھکرال نے انجن ڈرائیور بن کر اس شعبے میں مردوں کی اجارہ داری ختم کردی۔ اور ایک یہ ہے عالیہ۔ سطحی باتوں میں گھری ہوئی" سہیل کی بہن کے چہرے پر ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔

زینو چاچا نماز ختم کر چکے تھے اور سہیل کی بہن کی باتیں سُن رہے تھے انھوں نے اشارے سے سہیل کی بہن کو اپنے پاس بلایا۔ ان دنوں میں گفتگو

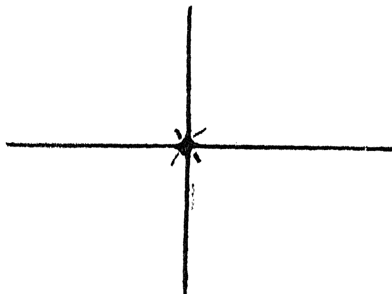
…رتی رہی۔ پھر اس کے بعد سہیل کی بہن نے عالیہ کے بارے میں کوئی ذکر نہیں
…یا۔ شاید زینو چاچا نے اُسے منع کر دیا تھا۔ لیکن سہیل یہ محسوس کر رہے تھے کہ ضرور
…ئی ایسی بات ہے جس کا ظاہر ہونا تکلیف دہ ہے اسی لئے وہ بات ان سے
…چھپائی جا رہی ہے۔

زینو چاچا نے دوسرے دن شہر جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس بار وہ
…سنجیدہ دلبر داشتہ شہر لوٹے — جاتے ہی کھٹیا پکڑ لی — پھر وہاں سے اُٹھے
…د قبر میں سو گئے۔

سہیل نے سوچا کہ آج زینو چاچا کی روح سارے بکھیڑوں سے آزاد
ہے — مقبرے کی رات کی چاندنی کرنیں ان کے جسدِ خاکی کے تودے پر نور پاشی
کرتی رہی ہوں گی اور طلوعِ آفتاب کی شعاعوں میں وہ آرام کی ابدی نیند
سو رہے ہوں گے۔

# صلیب کا بوجھ

تہہِ صلیب بھی جینا ہمیں عزیز رہا
یہ لوگ مرتے رہے ہیں زندگی بھی کرتے ہوئے



نرجس نے ٹیلیفون کی چھوٹی سی ڈائرکٹری کھولی تو نظروں کے سامنے شیلا کا نام تھا اور اس کا فون نمبر ـــــ شیلا کا دیہانت ہوئے ایک سال کا عرصہ گذر چکا تھا پھر بھی یہ نام اس کی ڈائرکٹری میں محفوظ تھا۔ نرجس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس نام کو کاٹ دے یا اس کے اطراف دائرہ بنا دے ـــــ یہ نام اس کو بہت عزیز تھا۔ اس نام سے ماضی کی کئی یادیں وابستہ تھیں ـــــ یہ نام اُسے یاد دلاتا تھا کہ ہمارا معاشرہ ابھی کتنا پچھڑا ہوا ہے کہ جہاں عورت نے سر اٹھایا، مرد نے اسے جھکا دیا۔

نرجس اور شیلا ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ نرجس دفتر کے قانون وضوابط سے اچھی طرح واقف تھی اسی لئے شیلا کو دفتری کام میں جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا وہ مدد کے لئے نرجس کے پاس پہنچ جاتی اور نرجس کو جب کوئی معاشی مسئلہ پریشان کرتا تو شیلا قرض کی شکل میں اُس مسئلے کو حل کر دیتی۔ اس طرح یہ دونوں دوستی کا حق نبھاتے رہتے۔

دفتر میں وہ دونوں ایک ساتھ لنچ کھاتے۔ کھانے کے دوران اپنے اپنے گھریلو مسائل پر باتیں کرتے۔ نرجس کے مسائل زیادہ تر معاشی ہوتے کیونکہ اس کا شوہر ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتا تھا۔ پرائیویٹ

کمپنیاں جہاں کام زیادہ لیتی ہیں وہاں اجرت کم دیتی ہیں۔ اور پھر اس کے شوہر کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ اس لئے وہ عادتاً بے دریغ پیسہ خرچ کرتا اور بیچاری نرجس خرچ اور آمدنی کا توازن برقرار رکھنے کے لئے اکثر قرض لے لیا کرتی۔ نرجس کی ایک اور پریشانی تھی اس کی سسرالی رشتے دار جو بیٹھ پیچھے اُسے جلی کٹی سناتی اور نرجس اس پر کڑھتی رہتی۔ اس کے کڑھنے پر شیلا چراغ پا ہو جاتی۔ "قرابت داری کا پاس، رشتے داری کی مجبوری" وہ اس کا مذاق اڑاتی۔ "عورت کی قربانی، عورت کا ایثار، کب تک یہ رٹ لگاتی رہوگی؟" وہ پوچھا کرتی "یہ سب کس کے لئے ہے؟ کیا ان بے حس، بے مروت اور اخلاق سے گرے ہوئے انسانوں کے لئے؟ جو اپنے عمل سے انسانوں سے زیادہ حیوانوں کی صف میں کھڑے کئے جانے کے لائق ہیں؟"

نرجس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ تو زمانے سے ڈری سہمی اپنے خول میں سمٹی رہنے والی عورت تھی جس کی بزدلی زمانے کو اس پر دندان تیز کرنے کا موقع دیتی۔ شیلا کے اُکسانے پر وہ زمانے کا منہ توڑ جواب دینے کی ہمت پیدا بھی کر لیتی تو عین وقت پر ہار جاتی اور پسپا ہو کر شیلا کے پاس لوٹ آتی۔ شیلا کو اس پر بہت غصہ آتا۔

"جو اپنی ذات کی مدافعت نہیں کرتا وہ گنہگار ہوتا ہے"۔

وہ کہا کرتی۔

معاشی آسودگی زندگی کے سارے پہلوؤں پر بھاری ہوتی ہے۔

تے گھر والے شیلا کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ضرورتمندوں کے کام
آتی رہتی تھی ۔ اس کے باپ اور دادا دونوں کا پیشہ وکالت تھا ۔ وکالت
سے انھوں نے خوب پیسہ کمایا تھا اور وراثت میں کافی جائیداد چھوڑی تھی ۔
شیلا وکیل صاحب کی پہلی اولاد تھی ۔ پھر دو لڑکے تھے ۔ بڑا لڑکا وکیل تھا ۔
چھوٹا ڈاکٹر ایک معذور لڑکی بھی تھی جس کے دونوں پاؤں پولیو سے بیکار ہوگئے
تھے ۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی گھر میں گھوما کرتی تھی ۔
شیلا نے صرف گریجویشن کیا تھا لیکن وکیلوں کی طرح جرح کرنے
کی عادت اس کے خون میں رچ بس گئی تھی ۔ وکیل صاحب اپنی بیٹی کی طبیعت
سے اچھی طرح واقف تھے اسی لئے شادی کے سلسلے میں جو بھی رشتہ آتا اُسے
خوب ٹھونک بجا کر دیکھتے ۔ ہر رشتے میں انھیں کوئی نہ کوئی نقص نظر آتا ۔
اسی چھان بین میں شیلا کی شادی کی عمر نکل گئی ۔ اب تو وہ بھی پریشان ہوگئے
ایک دن ان کے ایک موکل نے شیلا کے لئے ایک رشتہ لے آیا ۔ جو انھیں
بہت پسند آیا ۔ لڑکا عمر کی چالیس منزلیں طے کر چکا تھا ۔ سرکاری
دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا ۔ اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا ۔ یعنی نہ جلانے
والی ساس اور نہ کھٹکنے والی نند ـــــ وکیل صاحب نے سوچا کہ شیلا
اپنی شادی شدہ زندگی میں چین کی بانسری بجائے گی ۔ غرض بڑی
دھوم دھام سے بیٹی کی شادی رچادی ۔
شادی ہوئے کچھ مہینے گزرے تھے کہ وکیل صاحب کے داماد کا
بھرم کھلا ۔ وہ خصلت سے ساس بھی نکلا اور نند بھی ـــــ شیلا جب بھی

تمتمایا ہوا چہرہ لئے باپ کے گھر آتی اس کو واپس بھیجنا مشکل ہو جاتا۔ ماں عزت کی دہائی دینے لگتی اور باپ صبر کی تلقین کرنے لگتا — لیکن معاملہ دن بدن بگڑتا ہی چلا گیا — شیلا اپنے وجود کا اثبات چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ شوہر سے کسی معاملے میں سمجھوتہ کرنے تیار نہیں تھی — دوسری طرف اس کا شوہر اسے کسی قسم کی آزادی دینے تیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ دوستوں کی آمد و رفت پر بھی پابندی لگادی۔ اور شیلا کا بل نکلنے کے لئے اس نے ایک ترکیب سوچی اور حکم لگایا۔

"آج سے دفتر جانا بند"

شیلا اس بات پر کیسے راضی ہوتی کہ کوئی اس کے پر و بال کاٹ دے تاکہ وہ پرواز نہ کر سکے — پھر اس کی کوئی سنتان بھی نہیں تھی۔ جو اس کی آزادی کے پاؤں کی زنجیر بنتی ... اس نے احتجاج کے طور پر شوہر کا گھر چھوڑ دیا — باپ کے گھر آئی تو اعلان کیا کہ وہ اپنی بھوک کھانا اور اپنی نیند سونا پسند کرتی ہے — ماں باپ نے بھی شیلا پر اب دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔

شیلا کے اس طرح باپ کے گھر آجانے پر محلے والوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں — کھا دجوں نے ناک بھوں چڑھائے رکھیں — لیکن وکیل صاحب کے ڈر سے سب خاموش رہیں۔

شیلا کی خواہش کے مطابق وکیل صاحب نے داماد پر طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا — مقدمہ بازی چلتی رہی — فریقین نے مقدمہ بازی

ہار نہیں مانی ـــــ وکیل صاحب شیلا کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ بیٹی کی قسمت پر
دل ہی دل میں کڑھتے رہے ـــــ آخر وہ بھی گوشت پوست کے انسان تھے ۔ بیٹی کی
زندگی میں پھیلا اندھیرا رفتہ رفتہ ان کے دل کی شریانوں میں اترتا چلا گیا ۔ ان کے
دل نے ہار مان لی اور ایک دن وہ دھڑکتے دھڑکتے رک گیا ۔

شیلا کے بھائیوں نے باپ کی چتا میں آگ لگائی تو شیلا کے خلاف
ان کے دل میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے ـــــ انہوں نے شیلا کو مورد الزام
ٹھہرایا کہ پتا کی موت کا کارن شیلا کی گھریلو الجھنیں اور اس کا جھگڑالو دماغ ہے ۔
ـــــ پتا کی موت کے بعد بڑے بھائی نے شیلا کا طلاق والا مقدمہ اپنے ہاتھ پر
لینے سے انکار کر دیا ـــــ شیلا کس کا سہارا لیتی اس کی بنیاد تو ڈھ گئی تھی ۔
لہٰذا اس نے دوسرا وکیل مقرر کر لیا ۔

شیلا اپنی ماں کے ساتھ اس کے کمرے میں رہنے لگی ۔ وہ صبح شام
ماں کی خدمت کیا کرتی کیونکہ بہوؤں کو ساس سے کوئی سروکار نہیں تھا ۔ ان کی کاہلی
اور بے اصولی زندگی پر شیلا بھڑک اٹھتی تو بہویں ناراض ہو جاتیں اور شیلا کے
خلاف ساس کے کان بھرا کرتیں ۔ بھاوجوں نے شیلا کے ساتھ اپنا رویہ برقرار
رکھا ـــــ بھائیوں نے بھی اپنی تیوری چڑھائے رکھی ـــــ یہ ساری باتیں شیلا
کی باغی طبیعت کو چنوتی دیتی رہتیں ـــــ آخر بھائیوں کو سبق سکھانے کے لئے اس
نے موروثی جائیداد میں اپنے حصے کے لئے عدالت میں درخواست دے دی ۔
گھر کا سارا ماحول شیلا کے خلاف ہو گیا ۔ حتیٰ کہ معذور بہن نے بھی اس کا ساتھ
چھوڑ دیا ۔

جب دو دو وکیلوں کا خرچ شیلا کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تو
نرجس نے سمجھایا "مقدمہ بازی ٹھیک نہیں ہے۔ تم طلاق والا مقدمہ واپس لے لو
اور اپنے شوہر سے سمجھوتا کر لو۔"

"زندگی مرمر کر جینے کے لئے نہیں ہوتی ہے" شیلا الجھ پڑی "عورت
پر طمطراق دکھانے والا مرد قابلِ نفرت ہوتا ہے۔ میں اس مرد کو برداشت
نہیں کر سکتی"

اسی عرصے میں شیلا کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ شیلا کو یہ بات نرجس نے
بتائی "کیا تمہیں یہ خبر سُن کر افسوس نہیں ہوا"؟ نرجس نے پوچھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ ہم برسوں سے الگ رہ رہے تھے۔ میرے دل کے
آئینے سے اس شخص کا عکس مٹ چکا ہے"

"پھر بھی کچھ وقت تم دونوں نے ساتھ گزارا ہے"

"وہ میری زندگی کا المیہ تھا کیونکہ میں نے اپنی شناخت گنوا کر دا
سہی کھیں" نرجس خاموش ہو گئی پھر اس ذکر کو کبھی نہیں چھیڑا۔

ایک دن شیلا دفتر سے واپس آئی تو ماں کو بخار میں تپتا ہوا پایا
اس نے اپنا غصّہ ماں پر اتارا۔

"کب تک منہ بند کئے خاموش رہو گی۔ بخار میں تپ رہی ہو —
یہاں کوئی آپ کو پوچھتا ہی نہیں"

"جائیداد میں حصہ مانگ کر تم ہی نے ان سب کے دلوں میں نفرت
بوئی ہے۔ اب کس منہ سے انھیں کچھ کہوں"

ماں بیٹوں کی طرفداری کرتی تو شیلا کو سینے میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ـــــ اب ماں بھی اس کے حق میں نہیں تھی ـــــ دفتر میں اس کے ساتھی اُس کو دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی کیا کرتیں ـــــ اس کا طنطنہ ختم ہو چکا تھا ـ اس اندرونی چوٹ پر وہ تلملا اٹھی ـــــ ایک نرجس تھی جو اس کی ہمدم و مونس تھی ـ جس سے اس کا کوئی راز پوشیدہ نہ تھا ـ

جائیداد والے مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی ـ لیکن جب مقدمہ آگے بڑھتا ہوا نظر نہیں آیا تو اس کی وجہ معلوم کرنے شیلا وکیل کے دفتر پہنچی ـ وکیل نے کہا ـ

"شیلاجی ـــــ آپ کے بھائی جائیداد میں کچھ حصّہ دینے تیار ہو گئے ہیں ـــــ آپ بھی راضی ہو جائیے ـــــ ورنہ یہ کورٹ کچہری زندگی تمام آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گی"

شیلا بپھر گئی "کچھ حصّہ کیوں ؟ میں تو اپنا پورا حصّہ لوں گی ـ میرا ہزاروں کا روپیہ خرچ ہو گیا ہے وکیل صاحب ـــــ کیا آپ نہیں جانتے؟ ـــــ آپ سمجھوتہ کرنے کہہ رہے ہیں ؟"

"دیکھئے آپ کے بڑے بھائی تو خود وکیل ہیں ـــــ ان کا زیادہ خرچ نہیں ہوتا ـــــ پھر وہ دو بھائی ہیں ـــــ آپ اکیلی کب تک لڑتی رہیں گی ؟"

شیلا کا دماغ چکرانے لگا ـــــ جب اپنا ہی وکیل مخالف کی وکالت کرنے لگے تو مقدمہ جیتنے کی امید کیسے باقی رہتی ـــــ وہ خاموش

ہو گئی ـــــ خود غرضی اور مفاد پرستی کے ہتھوڑے اس کی خودی کی چٹان کو توڑ کر چکنا چور کر رہے تھے۔ شیلا کو ایسے لگا جیسے اس کی ہستی میں خود اعتمادی کم ہوتی جا رہی ہے۔ شیلا اکثر سوچتی "ہمارا سماج کب بدلے گا؟ عورت کب آزاد ہو گی؟"

پھر خود ہی جواب دیتی "شاید ابھی صدیاں درکار ہیں"

شیلا نے ٹھان لیا کہ بھائیوں سے پیسہ وصول کر کے اپنے لئے علیحدہ گھر بنائے گی۔ جس میں وہ ماں کے ساتھ رہے گی۔ نئے گھر کی تعمیر کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن شیلا اس مرحلے سے بھی گزر جانا چاہتی تھی۔ اتفاق سے گتے دار شیلا کے باپ کا موکل نکلا۔ اس نے چھ مہینے میں گھر تعمیر کر دینے کا وعدہ کیا۔

سچ ہے خواہشیں، تمنائیں، آرزوئیں انسان کو نچلا بیٹھنے نہیں دیتیں۔ انسان نہیں جانتا کہ آنے والا کل اس کے حصے میں کیا لائے گا پھر بھی وہ بڑے چاؤ سے اپنی خواہشوں کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔

شیلا ہر روز دفتر کے بعد اپنے پلاٹ پر پہنچ جاتی اور بڑے چاؤ سے اپنے گھر کو تعمیر ہوتا دیکھتی۔ جیسے جیسے گھر تعمیر ہوتا گیا۔ شیلا کی مصروفیت بڑھتی گئی ـــــ ایک دن وہ دفتر جانے نکلی تو راستے پر چکرا کر گر پڑی۔ وہ گھر واپس چلی گئی۔

دوسرے دن اس نے دفتر میں نرجس کو بتلایا کہ چکر آنے
وجہ ڈاکٹر نے کمزوری اور کام کا بوجھ بتایا ہے۔ بات
ی گئی ہو گئی۔ پھر اس بارے میں شیلا نے کوئی گفتگو
یں کی ۔

گپتے دار نے اپنا وعدہ پورا کیا اور چھ مہینے کے قلیل
صے میں "شیلا نواس" تعمیر کر دیا۔ شیلا کی ماں جانتی تھی کہ
یلا اپنے گھر چلی جائے گی تو رشتے داری کی ڈوریاں ہمیشہ کے لئے
ٹ جائیں گی ـــــ اس لئے اس نے شیلا کو مجبور کیا کہ وہ بھائیوں
ر بھاوجوں کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائے ـــــ شیلا اندر ہی
در ٹوٹ رہی تھی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ماں اس کی خاطر بیٹوں
چھوڑ رہی ہے اس لئے اس نے ماں کی بات مان لی ۔

گھر بھر آنے سے ایک دن پہلے شیلا نے ست نارائن
ی جا بڑے دھوم دھام سے کرائی ـــــ دوسرے دن "شیلا نواس"
قی قمقموں سے جگمگا رہا تھا ـــــ اس کے سامنے شامیانے تان
یئے گئے تھے ۔ کھانے کی میزیں سجا دی گئی تھیں ـــــ اس ساری
یاری میں نرجس اور شیلا کے خاندان والے کئی دن سے لگے
وئے تھے ۔

مہمانوں کی آمد شروع ہوئی ـــــ شیلا ان کے استقبال
ے لئے سجی دھجی دروازے پر آ کھڑی ہوئی ـــــ شیلا کے بھائیوں

کی لڑکیاں بھی مہمانوں کا پھول اور عطر سے سواگت کرنے شیلا کے قریب کھڑی ہوگئیں ـــــ یکایک شیلا کو چکر آگیا ـــــ وہ قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی ۔ اس کی حالت دیکھ کر لڑکیوں نے چیخنا شروع کیا ۔

"بوا۔ بوا۔ تمہیں کیا ہو رہا ہے ؟"

لیکن بوا کی گردن ڈھل گئی تھی ـــــ

دونوں بھائی بھاگتے ہوئے آئے ـــــ اور شیلا کو کار میں ہسپتال لے گئے ۔ مہمانوں کے دل دھڑکتے رہے کہ یکایک یہ کیا ہو گیا ہے ۔ سب دعا میں مصروف ہوگئے ـــ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ـــ ڈاکٹروں نے افسوس کے ساتھ شیلا کو مردہ قرار دیا ـــ

اس اطلاع کے ساتھ ہی سارے مہمانوں کو سانپ سونگھ گیا ۔ ماں کے چیخوں سے فضاء کانپ اٹھی ـــــ نرجس اور دوسرے رشتے داروں کا روتے روتے برا حال ہو گیا ۔

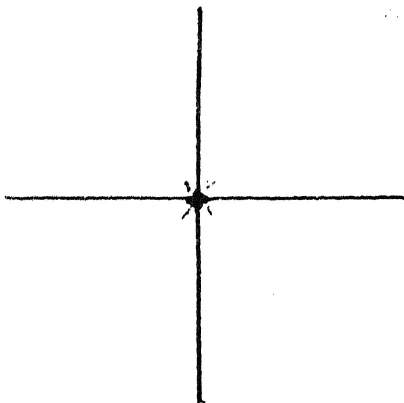
کچھ دنوں بعد نرجس کی ملاقات شیلا کے فیملی ڈاکٹر سے ہوئی ۔ ڈاکٹر نے جس راز پر سے پردہ اٹھایا وہ جان کر نرجس گم صم رہ گئی ـــ ڈاکٹر نے بتلایا کہ شیلا کا دل خطرناک حد تک پھیل گیا تھا ۔ اسی لئے اسے چکر آیا کرتے تھے ـــ موت کبھی بھی واقع ہو سکتی ہے یہ بات اس کو بتا دی گئی تھی لیکن وہ اس بیماری کو سب سے چھپائے رکھنا چاہتی تھی ۔"

"اس خطرناک مرض کو شیلا نے مجھ سے چھپایا! — آخر کیوں؟
نرجس نے حیرانی سے خود سے سوال کیا اور خود ہی جواب
ڈھونڈ لیا۔

"شیلا اپنی صلیب کا بوجھ تنہا اُٹھانا چاہتی تھی"

# لاش کی قیمت

گھاؤ چہرے پہ نہیں دل میں ہے دل کو دیکھو
ناوکِ غم کا نہیں وقت کا مارا ہوں میں



**قدیر** صاحب کے محکمے میں جاروب کش کی جائیدادیں نکلیں تو ایک جائیداد پر انھوں نے راجا کا تقرر کروادیا۔ راجا کا باپ قدیر صاحب کے بنگلے پر مالی کا کام کرتا تھا۔

راجا خوش قسمت تھا کہ اُسے مستقل سرکاری نوکری ملی تھی جہاں وہ ماہانہ ہزار روپے تنخواہ پاتا۔ جب کہ اُسی دفتر میں ہنگامی عملے کے کلرک گریجویٹ ہوتے ہوئے روزانہ ۲۴ روپے کے حساب سے صرف چھ سو روپے پاتے تھے۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے لیکن دوسری نوعیت کے ایسے چھوٹے موٹے کام جہاں وہ زیادہ کما سکتے ہیں، کرنے میں عار محسوس کرتے اور اپنی اندازِ فکر کی کوتاہی کا نتیجہ بھگتے۔ مستقل سرکاری نوکری اِن کے لئے ایک سہانا خواب بنتی جارہی تھی۔ قسمت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہر عہد میں سفید کالر کے عہدے کے لئے درمیانہ طبقہ پِستا رہا۔

راجا اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھا کہ اُس طبقے میں اس کی عمر والے لڑکے یا تو فارمس پر کام کرتے ہوئے کیڑا مار دواؤں اور کھاد جیسے مہلک اشیا کا شکار ہوتے یا مزدوری کرتے، رکشہ چلاتے اور

معاشی پستی میں زندگی گزارتے۔ ان کی جسمانی ذہنی اور اخلاقی قابلیت مجروح ہوتی اور محرومیاں ان کا نصیب ہوتا۔ قدیر صاحب نے نہ صرف راجا کا مستقبل سنوارا تھا بلکہ دفتر کے ماحول میں اس کے ذہن کو نشو و نما پانے کا موقع بھی فراہم کیا تھا۔

قدیر صاحب بوڑھے مالی کو بہت چاہتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے نئے شہر کے پہاڑی علاقے میں اپنے لئے بنگلہ تعمیر کروایا تو اس کے پچھواڑے ایک کمرہ بوڑھے مالی کے لئے بھی بنوایا۔ قدیر صاحب کے بنگلے کے آس پاس کئی اپارٹمنٹس تعمیر ہو چکے تھے۔ دوکانیں کھلنے لگی تھیں۔ علاقہ آہستہ آہستہ آباد ہو رہا تھا۔

دور غریبوں کی بستی سے رامی اور ریلا صبح صبح ان اپارٹمنٹس میں کام کرنے پہنچ جاتیں۔ انھیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا تعلق غریبی کے نیچے رہنے والوں سے ہے۔ کیونکہ اپارٹمنٹس میں رہنے والی لڑکیوں نے انھیں خوش پوشاک بنا دیا تھا۔ وہ شرٹ شلوار پہنتیں پونی ٹیل باندھتیں، آنکھوں میں کاجل لگاتیں اور ماتھے پر بندیا ——

رسیلی آنکھوں والی رامی تو راجا کے دل میں کھب گئی تھی۔ وہ اس کے بھولے پن پر مرمٹا۔ اس نے کئی بار دیکھا کہ اپارٹمنٹس جاتے ہوئے رامی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر قدیر صاحب کے بنگلے کو پرنام کرتی۔ جیسے وہ کوئی مندر ہو یا اس میں کوئی مورتی رکھی ہوئی ہو۔ راجا حیران رہتا پھر بھی اس نظارے سے اپنی آنکھیں سینکتا۔ ایک

، اس نے رامی کا راستہ روکا۔

"یہ تم ہمارے بنگلے کو پرنام کیوں کرتی ہو؟" راجا کی آنکھیں گلابی

رہی تھیں۔

"تم سے مطلب؟" رامی چیخ کر پوچھا۔

"میں بھی پرنام کروں گا اگر تم کارن بتاؤ"

یہ سُن کر رامی سوچ میں پڑ گئی پھر کہا "کارن تو میں نہیں جانتی۔ بس

ں نے کہا تھا آتے جاتے اس بنگلے کو پرنام کروں"

یہ سُن کر راجا ہنسنے لگا۔ رامی بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگی۔ اسطرح

دونوں کی دوستی کا آغاز ہوا، اور ہنستے ہنستے انھوں نے گھر آباد کرنے

سوچ لی۔ کیونکہ رامی بھی اس کٹیلے نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔

رامی کا تعلق قبائلی طبقے سے تھا۔ راجا کا تعلق درج فہرست

ت سے نہیں تھا۔ اسی لئے جب ان دونوں کی دوستی کا علم راجا

، باپ کو ہوا تو وہ غصے میں بھر گیا اور راجا سے پوچھا۔

"کیوں رے راجا؟ ہماری جات کی ساری چھوکریاں مر گئیں

یا رے؟"

"لیکن باپو مجھے رامی بہت پسند ہے" راجا کے لہجے میں عاجزی

ی۔

"میرے مرنے کے بعد اس سے بیاہ کر لے" اس نے غصے سے

ندھے پر پڑا رومال جھٹکا۔

"بابو۔ میرے دفتر میں کئی بابو لوگ جات سے باہر بیاہ کیے ہیں"
راجانے ان کا سہارا لیا۔

"ہمیں بڑے لوگوں سے کیا لینا دینا" غصّے سے کہہ کر وہ
چلا گیا۔

راجا بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ اُسے یاد آیا کہ اُس کا باپ
اپنے مالک سے بہت ڈرتا ہے اور قدیر صاحب انسانوں کی اونچ نیچ کے قائل
نہیں ہیں۔ وہ اپنی شادی کا مسئلہ لئے ان کے پاس پہنچ گیا۔ قدیر صاحب
راجا کی سوجھ بوجھ سے بہت خوش ہوئے فوراً مالی کو بلا بھیجا اور
پوچھا۔

"کیوں رے مالی؟ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے؟ راجا کی شادی رامی
سے کیوں نہیں کرتا"

"مالک! وہ لڑکی ہماری جات برادری کی نہیں ہے" مالی نے
ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"وہ تیرے دیوی دیوتاؤں کو مانتی ہے نا؟ انھوں نے پوچھا
"مانتی ہوگی مالک" مالی نے سر جھکا کر کہا۔
"پھر تجھے اور کیا چاہئیے؟ بوڑھے مالی زمانہ بدل گیا ہے ـــ
لیکن تو نہیں سمجھے گا۔ چل اب راجا کی شادی کے لئے راضی ہو جا۔"
"جو حکم مالک" مالی کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔

لالو۔ جو رامی کا باپ تھا اس کا سارا کنبہ گاؤں میں رہتا تھا۔

اس کے پاس بھی ذات پات کا مسئلہ تھا لیکن اس نے سوچا کہ سرکاری نوکری والا داماد کس کو ملتا ہے اور پھر راجا اور رامی کی جوڑی تو سارس کی سی جوڑی بنی رہے گی۔ وہ فوری راضی ہو گیا۔ لیکن اس نے ایک شرط رکھی کہ بیاہ کے بعد رامی اس بنگلے میں نہیں رہے گی۔

راجا اس انوکھی شرط کو سن کر حیران ہوا۔ اُسے رامی کا ہر روز اس بنگلے کو پرنام کرنا یاد آگیا۔ چنانچہ بنگلے کا بھید جاننے وہ لالو کے گھر پہونچا۔

"کارن جاننا چاہتے ہو" لالو نے پوچھا۔

"ہاں" راجا نے کہا۔

"کارن بتا دوں تو بیاہ کے بعد میری اس کٹیا میں رہنا پڑے گا"

لالو نے دوسری شرط سنائی۔

"کیوں؟" راجا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"گاؤں میں میرا سارا کٹم ہے۔ رامی کے بیاہ کے بعد میں وہاں چلا جاؤں گا۔ اور یہ گھر میں رامی کو دے دوں گا" لالو شوق سے اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔

پھر کہا۔

"راجا بیٹا۔ ہم یہاں اس وقت سے رہتے ہیں۔ جب رامی ننھی تھی۔ اب یہ جمین ہماری ہو گئی ہے۔ اسے کبھی نہیں بیچنا۔"

راجا نے ایک نظر لالو کے مٹیالے محل پر ڈالی - چاہتا تھا کہ شرطیں ماننے سے انکار کر دے کہ اس کی نظر دروازے کے اوٹ میں کھڑی رامی پر پڑی جو عشق کے شکنجے میں پھنسی تو گرفتار پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ راجا کا انکار اقرار میں بدل گیا - اس نے کہا۔

"اچھا تم کارن تو بتاؤ کہ بیاہ کے بعد رامی ہمارے بنگلے میں کیوں نہیں رہے گی"

لالو خاموش رہا - کچھ دیر اپنی انگلی سے زمین پر بے معنی لکیریں کھینچتا رہا - پھر سر اٹھا کر راجا کو دیکھا اور اپنی بپتا سنانے لگا ——

شہر کے ویران اور پہاڑی علاقے میں پتھر پھوڑنے کے لئے گتے دار کو مزدور نہیں مل رہے تھے - اسی لئے گتے دار نے گاؤں سے کچھ قبائلی مزدور پکڑ لائے اور چٹانوں سے بھرے علاقے میں کام پر لگا دیا - ان میں لالو کا باپ بھی تھا - جو دن میں پتھر پھوڑ دیا اور شام ہوتے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دن بھر کی کمائی پی کھا کر اڑا دیتا - آنے والے کل کی ضرورت کے لئے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی - پھر بھی وہ تاروں کی چھاؤں میں بے فکری کی نیند سو جاتا - اسے یقین ہوتا کہ جو بھوکا اٹھاتا ہے وہ بھوکا سلاتا نہیں - سچ پوچھو تو کل کی زندگی مزدور ہی بسر کرتے ہیں -

مہینوں پتھر پھوڑنے کا کام چلتا رہا - جب کام پورا ہوا تو گتے دار مالا مال تھا اور ان قبائلیوں سے بہت خوش ——

گتے دار نے سوچا کہ اب جبکہ حکومت غریبوں میں غیر آباد زمین بانٹ رہی ہے کیوں نہ ان مزدوروں کے لئے کوشش کی جائے جن کی محنت شاقّہ اس سے کوئی محاسبہ نہیں کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے کوشش کی اور مزدوروں کو وہاں کی زمین مل گئی۔

انسان کا تعلق ہمیشہ زمین سے گہرا رہا ہے۔ آب د گل اس کے عناصر ہیں مزدور زمین پائے تو بہت خوش ہوئے گو انھیں اب مزدوری کی تلاش میں دور دور تک جانا پڑتا تھا۔ لالو کا باپ بھی اس زمین کو۔ اس جھونپڑی کو اپنا کہنے میں فخر محسوس کرتا۔ لالو کا باپ بوڑھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ دن بھر کی سخت محنت پھر میلوں کا پیدل چلنا ــــ وہ تھک جایا کرتا ــــ آخر اس کڑی مشقت سے کھٹیا پر پڑ گیا ــــ شہر کا دواخانہ وہاں سے بہت دور تھا اور وہ دواخانہ جانے راضی نہ ہوتا۔ سارا دن جھونپڑی میں پڑا کراہتا رہتا۔ لالو کی بیوی بے دلی سے اس کی خدمت کیا کرتی۔ بوڑھے کی نقاہت بڑھتی گئی۔ ایک رات وہ ایسا سویا کہ پھر کبھی نہیں جاگا۔

دواخانے کی طرح شمشان بھی اس پہاڑی علاقے سے بہت دور تھا۔ اور لالو مفلس و لاچار ــــ گتے دار بھی لالو کی مدد کرنے شہر میں موجود نہیں تھا۔ آخر بستی والوں نے طے کیا کہ بوڑھے کی سمادھی اسی کی جھونپڑی کے پیچھے بنا دی جائے۔ اور سمادھی وہاں بن گئی۔

دن اور رات ہفتوں مہینوں اور برسوں میں بدلتے گئے۔ ساتھ ساتھ شہر کا نقشہ بھی بدلتا گیا۔ شہر کا نقشہ بدلا تو قبائیلیوں کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ شہر کے ایک بلڈر نے اندازہ لگایا کہ آئندہ وہ زمین سونا اگل سکتی ہے اور تھوڑی سی قیمت پر ان غریبوں سے خریدی جا سکتی ہے۔ غریبوں کا استحصال ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ بلڈر نے زمین کا جو مول بتایا وہ سُن کر قبائلی حیران رہ گئے۔ زندگی میں اتنا اکٹھا روپیہ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ خوشی خوشی زمین بیچنے راضی ہو گئے۔

ایک لالو تھا جو اپنی زمین بیچنے تیار نہیں تھا۔ "باپو کی سمادھی کا کیا ہوگا" وہ سوچا کرتا۔ لیکن بلڈر کے آدمی اسے چین بیٹھنے نہیں دیتے۔ وہ اُسے اکساتے رہتے، ورغلاتے رہتے زیادہ پیسوں کا لالچ دیتے۔ لالو کہاں تک اپنے کو بچاتا۔ آخر اس کے جذبات اس کی محبت اس کی عقیدت سب داؤ پر لگ گئے اس نے باپو کی سمادھی کو آخری پرنام کیا اور وہاں سے چل پڑا۔

مزدوروں نے وہاں سے کچھ دور ایک اور بستی بسالی —

وہ رات دھوئیں کی طرح کالی تھی جس رات لالو کی بیوی ننھی رامی کو سوتا چھوڑ کر پیسوں کے بکس کے ساتھ بھاگ نکلی۔

امی نیند سے جاگی تو رو رو کر لالو کو بھی جگایا ۔ جھونپڑی کا دِیا
نیا تھا ۔ باہر ہوائیں سائیں سائیں چل رہی تھیں ۔ لالو کی بیوی
میں پتا نہ تھا ۔ لالو کا اثاثہ لُٹ چکا تھا ۔

یکایک لالو خوف سے کانپنے لگا ۔ اس نے ننھی رامی کو سینے
پٹا لیا ۔

"میرے باپو کی آتما نے مجھے سجا دی ہے" وہ خود سے کہہ
ہا اور رو رہا تھا ۔

دوسرے دن بل ڈوزر کی آواز سے وہاں کی فضا کانپ
. زمین ہموار ہو رہی تھی ۔ جب پلاٹس بکنے لگے تو لالو کی زمین قدیر صاحب
اٹ میں آگئی ______

راجا نے دیکھا کہ لالو کے آنسو بہہ رہے ہیں ۔ وہ ندامت کے
تھے یا خوف کے ، راجا یہ نہ جان سکا لیکن اس نے سوچا کہ بھولے
کے دکھ کا علاج اور اس کے درد کا درماں اسی میں ہے کہ اس کی
لیں مان لی جائیں ۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی ۔ آسمان پر تارے
ایک کر کے غائب ہو رہے تھے ۔ سٹی بس ڈپو پر مسافروں
ہجوم تھا ۔ ان کے درمیان کھڑی رامی رُو رُو کر لالو سے کہہ
تھی ۔

"باپو ۔ رک جاؤ نا باپو"

"پگلی روتی کیوں ہے اب تو تیرا بیاہ ہو گیا ہے - اور راجا تیرے ساتھ ہے" لالو نے کاندھے پر پڑے رومال کے کونے سے بیٹی کے آنسو پونچھے۔

"رامی بہت رو رہی ہے - رک جاؤ نا بابا یو" راجا نے کہا۔

"ارے نہیں رے راجا - میں جلدی آجاؤں گا - دیکھ رامی ابھی نادان ہے ——— تو اس کا دھیان رکھنا"

لیکن لالو کو کیا خبر تھی کہ یہ اس کا آخری سفر ہو گا - اب وہ شہر کبھی واپس نہیں لوٹے گا - کیونکہ آدھی رات کو نکلی وہ بس جب کنٹے پر پہنچی تو ایک کار کو اوورٹیک کرتی ہوئی ریلنگ سے جا ٹکرائی ——

بس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ریلنگ کو توڑتی ہوئی اپنے مسافرین کے ساتھ ساگر میں گر پڑی ساگر کی موجوں نے تباہی اور ہلاکت کا شور مچایا پھر موجیں پرسکون ہو گئیں۔

اس حادثے کی خبر ملتے ہی حکام وہاں پہنچ گئے۔ کرینوں کی مدد سے بس کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ ساگر کے پانی میں ہر سال گنیش کی مورتیوں کا وسرجن ہوا کرتا - کرینیں صرف بڑی بڑی سلاخیں اور مورتیاں بٹھانے کے فریم باہر نکالتے رہے لیکن بس کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ حکام پریشان تھے - آخر توجہ کی مدد حاصل کی گئی -

عوام کی کثیر تعداد کٹے پر جمع ہو گئی تھی۔ پولیس کو
ا ہٹانے میں دِقّت پیش آرہی تھی۔ آخر فوجی کرینوں نے
اکا پتہ چلالیا اور جیسے ہی بس کو کسی قدر ساگر سے
اٹھایا، بس میں پھنسی نعشیں دکھائی دینے لگیں۔ موت کا یہ
ک منظر لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ چیخیں
رکر رونے لگے۔ ساگر کا سارا علاقہ چیخ و پکار سے ماتم کدہ
میا۔

ڈائرکٹر آر ٹی سی نے بس کے حادثے پر افسوس کا اظہار
در اعلان کیا کہ ہلاک ہونے والوں کے ورثاء کو فوری طور پر دو ہزار روپیے
س کے علاوہ پچاس ہزار روپیے دیئے جائیں گے۔
رامی کی آنکھیں روتے روتے سوجھ گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم
بعد لالو کی نعش لئے وہ راجا کے گھر جارہے تھے۔
ی موت کے غم نے رامی کے دماغ کو جنون و دیوانگی
مبتلا کردیا تھا۔

"چپ ہو جا رامی" راجا اُسے سمجھا رہا تھا۔
"تم نے میرے باپو کی سمادھی کیوں بیچی؟" رامی کا لہجہ اکھڑا
تھا۔

"پگلی سمادھی بنی کہاں ارتھی تو اپنے ساتھ ہے"
"پھر تم نے ارتھی کیوں بیچی اب باپو کی آتما مجھے سجا دے گی"

"ارتھی میں نے کہاں بیچی" راجا حیران تھا۔

"پھر یہ کیا ہے؟" ساڑی کے پلو میں بندھے راجا سے سوال کر رہے تھے۔